ماہنامہ

قومی زبان

انجمن ترقیٔ اردو کا ترجمان

علامہ اقبال

انجمن ترقی اردو
اردو روڈ۔ کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۰ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۶۷ء

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

شہریار دکن		۳
قانون کی تعلیم اور اردو	جسٹس اے آر کارنیلس	۵

بیادِ اقبال

اقبال کے فوراً بعد	ڈاکٹر سید عبداللہ	۷
بیادِ اقبال	جوش ملیح آبادی	۱۱
کلام اکبر بنامِ اقبال		
اقبال اور تصوّف	پروفیسر سید عبدالرشید فاضل	۱۵
حالی اکبر اور اقبال	نریندر رام جوہر	۲۵
مقدمۂ تذکرۂ شورش	ڈاکٹر محمود الٰہی	۲۹
عشقیہ شاعری اور جگر مرادآبادی	محمد شکیل احمد صدیقی	۳۵
مرحوم کی نظمیں	راجیندر ناتھ شیدا	۴۱
مصنف، ناشر اور قاری	ابن انشا	۴۷
ظریف جبلپوری	مینا زبیری	۹۵
گلدستۂ "نہالِ سخن" بریلی	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۶۳
شیخ عبدالقادر	مولانا حامد علی خاں	۴۹
اساس اردو	پروفیسر سید شبیر علی کاظمی	۷۳
گردوپیش	ادارہ	۸۷
نئے خزانے	ابو سلمان شاہجہانپوری	۹۷

شہریار دکن

دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر مرنے والا اپنے پیچھے یادوں کا ایک سلسلہ چھوڑ جاتا ہے اور انہیں یادوں سے مرنے والے کی شخصیت کو پہچانا جاتا ہے۔ شہریار دکن کی وفات پر پاکستان میں جس طرح اظہار افسوس کیا گیا اُس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آصف جاہ سابع کی شخصیت ہندوستان میں مسلم ثقافت کی آخری نشانی تھی۔ جن لوگوں نے نظام کی کتاب سیاست کا صرف غلط نامہ ہی پڑھا ہے انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ غیر منقسم ہندوستان میں اسلامی ثقافت کے تحفظ کے لئے نظام اور ریاست حیدرآباد نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ نظام کی ثقافتی و قومی خدمات کو چند سطروں میں بیان کرنا ممکن نہیں، برِصغیر کے کی شاید ہی کوئی ممتاز شخصیت ہو جس کی نظام نے حوصلہ افزائی نہ کی ہو۔ اور شاید ہی کوئی اسلامی ادارہ ہو جو اس منبع فیض کا ممنونِ کرم نہ ہو۔ اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لئے نظام کا کارنامہ اپنی نوعیت، اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے فقید المثال ہے انہوں نے حیدرآباد میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرکے اور جامعہ عثمانیہ قائم کرکے اس زبان کی صلاحیتوں کو جس طرح سے اُبھارا وہ اُردو کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔

نظام کے غم میں اُردو بھی شریک ہے

انجمن ترقی اردو کا علمی ادبی اور تحقیقی مجلہ

سہ ماہی "اردو"

اپریل سنہ ۱۹۶۷ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مضامین کی ایک جھلک:

محسن کا ترجمہ مخزن نکات	مولانا امتیاز علی عرشی
اردو کی مستعار آوازیں	ڈاکٹر شوکت سبزواری
یورپ کی شاعری پر عربی شاعری کا اثر	ڈاکٹر ریاض الحسن
تعلیم اور فطرت انسانی	ڈاکٹر سلامت اللہ
تلامذہ حشر	ڈاکٹر عبد العلیم نامی
مصحفی کا فارسی دیوان (جواب دیوان نظیری)	پروفیسر سید احتشام حسین
شبلی کی تاریخ رحلت اور اقبال	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ان کے علاوہ:

مرزا دبیر، مولانا حالی، سید احمد خاں، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے غیر مطبوعہ خطوط۔

مسلسل مضامین:

* کندمالا - ونگا اچاریہ کا ڈرامہ
* لغت کبیر اردو - از بابائے اردو
* اشاریہ مضامین اردو

ملنے کا پتہ:

انجمن ترقی اردو - بابائے اردو روڈ کراچی ۱

جناب جسٹس اے آر کارنیلیس

قانون کی تعلیم اور اردو

سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس نے ۲۵ فروری ۶۶ء کو جناح کالج حیدرآباد کے طلبہ کی یونین کا افتتاح کرتے ہوئے ایک بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبے میں انہوں نے اردو زبان کا بھی ذکر کیا ہے۔ ذیل میں اردو زبان سے متعلق حصے کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

ہمارے ملک میں جو قوانین رائج ہیں ان میں سے اکثر بنیادی طور پر انگریزی طرز کے ہیں۔ ان قوانین پر عمل درآمد کے سلسلے میں ہمارے وکلاء اور ججوں نے انگریزی دور حکومت میں ہمیشہ انگریزی عام قانون کے اصولوں کا سہارا لینے کی تربیت حاصل کی ہے۔ میں کسی طرح بھی اس قانون کے شاندار نظام کی اہمیت گھٹانا نہیں چاہتا۔ اس نظام نے تمام دنیا میں اہل قانون اور فلسفہ دانوں میں بہت بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اس کی قدریں نہایت اعلیٰ ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی عام قانون کے بہت سے اصول ابتدائی طور پر اس زمانے کے مسلمان مفکرین کی تحریروں سے ماخوذ ہیں جب کہ یورپ میں ابھی تہذیب کی روشنی بھی نہیں پھیلی تھی اور بڑے بڑے تہذیبی مراکز اسپین یا شمالی افریقہ یا مشرق وسطیٰ میں واقع تھے۔ لیکن وہ تمام اصول جو انگریزی عام قانون کی بنیاد ہیں، سب کے سب اسلامی عام قانون کے قواعد کے بالکل اسی طرح مطابق نہیں ہیں جس طرح انھوں نے مسلم مفکرین کی تعلیم اور اسلامی ممالک کی عدالتوں کے رواج کے ذریعہ ترقی پائی ہے۔ دونوں میں بہت سے نمایاں اختلافات ہیں اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ کہ اگر ایک آزاد قوم جس کا اپنا جدا مذہب ہو اور جس کے پاس ایک ایسا نظام ہو جس کی رو سے انسانی معاملات کے تمام مرحلوں میں اس مذہب کے اصول کے مطابق عمل درآمد ضروری ہو، اپنے پاس ایک وسیع فلسفۂ قانون اور اس کے بنیادی اصول رکھتے ہوئے باہر سے روشنی تلاش کرتی ہے تو یہ امر بلاشبہ اس قوم کی خودداری کے منافی ہے۔ مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے ملک کے جج صاحبان جو صرف انگریزی زبان میں قانون کا کام کرتے ہیں اپنے لئے اس سے زیادہ اعلیٰ امتیاز کی توقع نہیں کر سکتے کہ ان ملکوں کے اعلیٰ ججوں کے کمالات کے بھی محض نقال ہو کر رہ جائیں جہاں انگریزی قومی زبان ہے۔ مجھے یقین ہے

کہ اگر ہم یہ خیال رکھیں کہ ہمارے سامنے جو معاملات آتے ہیں انہیں حل کرنے کے لئے فلسفۂ قانون کا ضروری اصول ہمارے ہاں پہلے ہی سے موجود ہے تو ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں بہت زیادہ مسرت محسوس ہوگی۔ ان اصولوں کی تشریح و تفسیر کرنا اور انہیں ترقی دینا ہمارا فرض ہے اور ہمارے لئے موجب افتخار ہونا چاہئے ——— اور وکلا کے لئے بھی جو عدالت کو صحیح اصولوں کے ماتحت جائز فیصلہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

آپ حضرات کے لئے جو یہاں اس امر کی تربیت پا رہے ہیں کہ قانون کے مطابق کام کریں یا کسی اور طریق پر قانون کی تعمیل کا ذریعہ بنیں یہ بہتر ہوگا کہ اپنی ان کوششوں کے قطعی نتائج اور ثمرات پر غور کریں جنھیں بروئے کار لانے کے آپ خواہش مند ہیں۔ آپ کا یہ فرض ہوگا کہ دستور کی شرائط کے مطابق پاکستان میں قانون کے ذریعہ معاشرتی انصاف رائج کیا جائے۔ آپ کو اپنا فرض سمجھنے کے لئے غیر ملکی ذرائع کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی قابلیت اور استعداد کو پورا پورا کام میں لاتے ہوئے اس فرض کی ادائیگی کے لئے آپ کو جو کچھ کرنا ہے وہ اسلامی فلسفۂ قانون میں پہلے ہی سے موجود ہے، شاید آپ خیال کریں کہ عربی زبان کی تحصیل ایک بڑی رکاوٹ ہے، لیکن وہ اصحاب جو اردو سے واقف ہیں، ان کے لئے انگریزی میں قانونی اصطلاحات پر پورا پورا عبور حاصل کرنے کے مقابلہ میں غالباً قانونی عربی حاصل کرنا زیادہ آسان ہے۔ بہ حالات موجودہ آپ کے لئے قانونی انگریزی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں یہ ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری نہیں۔ اردو زبان میں عربی اصطلاحات پہلے ہی سے پورے طور پر مستعمل ہیں اور مسلسل کوشش سے بہت ہی تھوڑے عرصے میں اسے جملہ قانونی اور عدالتی کارروائیوں کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے اس امر کا اطمینان حاصل کرنے میں بڑی مدد ملے گی کہ پاکستان کے اس حصے میں عوام کے مسائل کا نہ صرف منصفانہ فیصلہ ہو بلکہ عوام انصاف کو دیکھیں اور سمجھیں بھی۔

میری دعا ہے کہ وہ دن جلد آئے۔

انجمن ترقی اردو کی ایک نئی کتاب

پشتو شاعری

مؤلفین

فارغ بخاری

رضا ہمدانی

جس میں پشتو زبان و ادب کی تاریخ اور اعلیٰ شعری نمونوں کے منظوم تراجم پیش کئے گئے ہیں۔ ترجموں میں تخلیقی انداز کارفرما ہے۔ پشتو شاعری سے آگاہی کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

آفسٹ پر خوبصورت طباعت۔ صفحات ۲۵۶ قیمت صرف ۴ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ڈاکٹر سید عبداللہ

اقبال کے فوراً بعد

حکیم الامت ابھی زندہ ہی تھے۔ ادھر ان کے فکر کے خلاف چند واضح ردِ عمل نمودار ہو رہے تھے ان میں سے ایک ردِ عمل ترقی پسندی کی تحریک تھی اور دوسرا ردِ عمل ہیئت پرستی اور زمین پرستی کی تحریک جس کی نمائندگی میراجی نے کی۔

ادب و شعر کی دنیا میں ہیئت کے تجربے ہوتے رہتے ہیں اور ان تجربوں پر کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ لیکن ان نئے تجربوں کے ساتھ ساتھ اگر اجتماعی فکر یا قوم کے بنیادی عقیدوں پر بھی زد پڑتی ہے تو معاشرے کو حق پہنچتا ہے کہ وہ آزادی سے ان نئے عقیدوں کی چھان بین کرے اور انکے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلہ صادر کرے۔ ہاں یہ تسلیم ہے کہ اس چھان بین میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔

ترقی پسندی کی تحریک ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر بہت لکھا جا چکا ہے اس لئے فکر اقبال کے اس ردِ عمل پر اس وقت گفتگو نہیں کروں گا۔ البتہ اس دوسرے ردِ عمل کے بارے میں مختصراً اضافات پیش کر رہا ہوں۔ ان کا تعلق میراجی کی شاعری سے ہے۔ قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ اقبال کے فوراً بعد اقبال کے خلاف دانستہ یا نادانستہ یہ تحریکیں کیوں اٹھیں اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ انکی نوعیت کیا تھی؛

میں جو کچھ کہنے والا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میراجی کی فکری تحریک اکثر صورتوں میں اقبال کے خیالات کی ضد تھی اس کے علاوہ مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ میراجی کی شاعری نغمگی موسیقی اور رمز کی شاعری تھی اور اس حد تک مجھے اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اس فکر پر ہے جو میراجی کی شاعری میں موجود ہے۔ میں اقبال کے ساتھ میراجی کو اس لئے معرض بحث میں لا رہا ہوں کہ اقبال کے افکار کے ساتھ ساتھ ان خودی شکن افکار کا تصور بھی سامنے آجائے۔ جن کے خلاف حضرت علامہ نے ایک عمر صرف کی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ شاعر مشرق نے جس وطنیت و زمین پرستی پر شدید احتجاج کیا وہ اب قوم کے ایک طبقے میں ایک موثر فرقے کا مذہب ہے اس کے لئے طرح طرح کے الفاظ اور اصطلاحیں تراشی گئی ہیں۔ مثلاً اس ملک کا اصلی کلچر، اس ملک کی بو باس، پاکستان کا زمینی کلچر وغیرہ وغیرہ۔ اور اب تو اس غرض کے لیے باقاعدہ رسالے نکالے گئے ہیں جن میں ادب کے نام سے ہندو دیومالا اور زمین کی پرستش کا سبق دیا جا رہا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا میراجی سے ہوئی۔ اسی لئے میں میراجی کا خاص ذکر کر رہا ہوں۔

مجھے پورا پورا احساس ہے کہ حکیم مشرق اقبال کو جوگی میراجی اور ان کے پیرو شاعروں کے سامنے لانا شاید شاعر مشرق کے ساتھ بے انصافی ہوگی پھر بھی میں جرأت اس لئے کر رہا ہوں کہ اثرات اور ردِ عمل کی بحث میں یہ ناگزیر ہے۔ یہ میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ میراجی کی شاعری نوجوانوں کے

ایک گروہ میں بے حد مقبول ہے اور ایک خاص گروہ تو میراجی کو اپنا فکری امام مانتا ہے۔ اور یہ رویہ اور یہ عقیدہ روز بروز بڑھ رہا ہے اور اگرچہ یہ لوگ دبی زبان سے اقبال کو بھی مانتے ہیں اور میراجی کو اقبال کے مقابلے پر نہیں لاتے پھر بھی اپنی خلوتوں میں برملا کہتے ہیں کہ اس ملک کا اصلی شاعر میراجی ہی ہے۔ جو اس ملک کے دیوتاؤں اور اس سرزمین کے جنگلوں اور وادیوں کی تعریف کرتا ہے۔ اقبال تو روم و شام اور سمرقند اور بخارا کا شاعر ہے اور یہ بات واقعی قابل غور ہے ان وجوہ سے ایک مدرس اور مورخ ادب کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان جدید الفکر فکر آزماؤں کے اس فکری رویے کو نظر انداز نہ کرے اور عقلی قومی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے اس رویے کی صحیح اہمیت معلوم کرے اور قوم کو خود فیصلہ کرنے کا موقع دے کہ یہ رویہ قومی و اجتماعی زندگی کے حق میں کہاں تک صحت مند ہے یا مضر ہے جو میراجی نے یا انکے پیروؤں اور مقلدوں نے ہمیں دیا۔

میں میراجی کو ماننے والوں میں ہوں میراجی کی شاعری میں جو موسیقی ہے اور ان کے نغموں میں جو درد اور بیراگ کا سوز ہے اس سے کم از کم میں انکار نہیں کر سکتا میں ان لوگوں سے خود کو الگ سمجھتا ہوں جو کسی شاعر کو محض اس لیے ادب کی تاریخ سے نکال دیتے ہیں کہ وہ میر کے مانند نہ ملتا تھا ــــ میں تو شیخ امام بخش ناسخ کو بھی مانتا ہوں جو بیٹھے بٹھائے فولاد سے ہاتھی کا بچہ پیدا کرنے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔ میں تو انشاء سے بھی بددل نہیں ہوا جنہوں نے اچھی شاعری کرتے کرتے بیچ ہی میں ایک دن دیوار پھاندنے کی حرکت کر دی اور اس کا نقشہ بھی کھینچ دیا۔

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

تو ایسے حالات میں بحیثیت مدرس کسی سے بددل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اصل سوال یہ ہے کہ کسی شاعر کی شاعری کیا ہے اور یہ بھی کہ اس شاعر کی شاعری میں جو فکر ہے وہ فرد کی پاکیزہ زندگی اور اجتماع کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کیا قدر و قیمت رکھتا ہے؟

اس بحث کی دوسری صورتیں بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ ادب و فن کو جانچنے کے ایک نہیں بیسیوں طریقے ہیں مگر آج میں اقبال کے تصور ادب و فن کی روشنی میں اس بحث پر گفتگو کرنا ضروری خیال کرتا ہوں یہ اس لیے بھی کہ معاملہ قوم کی فکری تعمیر کا ہے اور ہم ایک لحظہ بھی ملک کے اس رخ سے غفلت نہیں برت سکتے کہ ہماری فکری تعمیر کے لئے کون سی چیزیں مفید ہیں اور کون سی مضر ہیں لہٰذا میراجی کی شاعری کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا ہو گا وہ اقبال کے تصور ادب کی روشنی میں کہنا ہو گا۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ میں میراجی کی شاعری یا فکر کو اقبال کے فکر کا کم و بیش مخالف رد عمل سمجھتا ہوں اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اقبال کا تصور شعر (تصور فن) ان کے نظریہ خودی کے تابع ہے اور ان کا نظریہ خودی مسلمانوں کی اجتماعی قومی اور تہذیبی خود شناسی اور احیاء کا ایک پیغام، ایک دستور العمل ہے۔

اقبال کے تصور شعر کے لئے میں اقبال کے ایک نثری مضمون "حضرت رسالت مآب کا ایک ادبی تبصرہ" کا حوالہ دیتے ہوئے آنحضرت کی دو ادبی تنقیدوں کا ذکر کرتا ہوں۔ آنحضرت نے امرء القیس کے بارے میں فرمایا۔ "ہو اشعر الشعراء و قائدہم الی النار۔" (ترجمہ: وہ شاعروں کا سردار ہے مگر جہنم کا رہنما بھی وہی ہے) ایک اور موقع پر آنحضرت نے قبیلہ بنو عبس کے ایک شاعر عنترہ کا ایک شعر سن کر فرمایا "میں کسی عرب کی ملاقات کے لئے اتنا مشتاق نہیں ہوتا ہوں جتنا اس شاعر کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہوں۔"

وہ شعر یہ تھا:-

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ ؛

حتی انال بہ الکریم الماکل

ترجمہ:- میں رات بھر محنت مشقت کرتا رہا تاکہ میں حلال روزی پر قادر ہو سکوں۔

ان دونوں حدیثوں کا ذکر کرکے اقبال نے ادب یا صحیح ادب کے بارے میں کچھ نتیجے نکالے ہیں ان کی ایک خاص فکری صورت بنتی ہے اہم سوال یہ ہے کہ امرأالقیس کی شاعری کیوں ناپسند کی گئی اور عنترہ کی شعر میں کیا خاص بات تھی کہ آپ نے اسے پسند فرمایا اقبال کے نزدیک وجہ یہ تھی کہ امرأالقیس کی شاعری میں صنعت گری کا کمال ہے۔ مگر اس شاعری کے افکار یکسر زندگی کے منافی ہیں اس کے برعکس عنترہ کے شعر میں زندگی کا ایک بلند نصب العین پیش کیا گیا ہے۔

اقبال نے اپنے مذکورہ بالا ادبی تبصرے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ شاعری فن کے لئے بھی ہو سکتی ہے مگر اس کی غایت جہاد قومی کی خدمت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعری زندگی کے تابع اور پاکیزہ زندگی کی رہنما ہے اور معلوم ہے کہ اقبال نے جس اجتماع کو مدِ نظر رکھا ہے وہ ہندستان کی حدود میں مقید نہ تھا بلکہ اس کی قلمرو نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر پھیلی ہوئی تھی اقبال منفعیت کے شدید مخالفوں میں سے تھے۔

اقبال کے نزدیک شاعری کا ایک مقصد عمل اور جدوجہد کی ترغیب اور ذاتی سطح پر وجدان صحیح اور ضمیر صالح کی دریافت ہے جلال اقبال کی سب سے بڑی جمالیاتی قدر ہے۔ صنف نازک، نرمی، ملائمت اور منفعل لہجوں کے اقبال بہت مخالف ہیں۔ توحید اقبال کا سب سے بڑا عقیدہ ہے اور توحید سے مراد اس وحدت کی تلاش ہے جو حی و قیوم، سمیع و بصیر اول و آخر، ظاہر و باطن ہے اور حیات و کائنات کا مصدر اور خالق ہے یہی توحید ہے جسے شاعری کے سارے عناصر میں موجود ہونا چاہیئے رومی نے اسی کو گرمی ہو اللہ کہہ کر دینی شاعری کی تعریف کی تھی اور اقبال بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں یہ تو ہے اقبال کا تصور شاعری۔ اب تھوڑی دیر کے لئے میرا جی کی طرف آجایئے۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ میں انفرادی سطح پر میرا جی کی نظموں سے متاثر ہوا ہوں۔ میرا جی نے لفظوں کی موسیقی آہنگ کی دلآویزی آزاد نظم کی شیرازہ بندی اور اس میں علامتوں کے ماہرانہ استعمال سے فن کاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ میرا جی نے اپنے میٹھے گیتوں سے بہت سے جاگتوں کو سلایا ہے بہت سے ہوشیاروں کو بے خود بنایا ہے۔ بہت سے راہروں کو چلتے چلتے رکنے پر مجبور کر دیا ۔۔۔ یہ ساحری، یہ جادوگری میرا جی کو ملی اور خوب ملی کسی کو بھی اس سے انکار نہیں۔

مگر حضرات اہم سوال ان افکار اور رویوں کا ہے جن سے میرا جی کی شاعری لبریز ہے۔ میرا جی کے افکار یہ ہیں:-

۱۔ دھرتی پوجا۔

۲۔ ہندو دیومالا کا احیا۔

۳۔ ادب و فکر کی ہندی روایت کی طرف رجعت،

۴۔ بے جہت، داخلیت۔ تشکیک اور زندگی سے گریز۔

۵۔ موت، سمندر، عورت اور جنگل کے موضوعات۔

۶۔ ہیئت سے متعلق طرز اظہار میں علامت نگاری اور ابہام۔

میرا جی کے تیئں ایک اس مختصر سی فہرست سے ہی یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ ہمارا ایسا کوئی شاعر جس نے شعوری طور پر یہ کہا ہو کہ خاک اقبال سے مختلف ہے اقبال کے حب وطن میں کسی کو کلام نہیں ۔ مگر — وطن سے وہ اس لیے محبت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے محبوب عقیدوں کا گہوارہ ہے۔ ہندو فلسفیوں اور شاعروں کی عظمت سے اقبال نے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ جاوید نامہ میں ان میں بہت سے وطنوں کو اعلیٰ مقامات میں دکھایا ہے مگر یہ اعتراف عظمت فکری رہنمائی کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ان کے ذہن کی بلندی اور ان کے حکیمانہ شغف کے اظہار کے لیے ہے۔ میرا جی نے جنگلوں سے دلچسپی لی ہے مگر سب صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ اقبال جنگلوں کے شاعر نہیں، پہاڑوں کہساروں اور چٹانوں کے شاعر ہیں۔ میرا جی نے عورت کو اپنے بہت سے تصورات کی علامت بنا کر عورت کی شخصیت کو خیالی بنانے کی کوشش کی ہے مگر اقبال کے یہاں مرد اور عورتیں بھی ہیں اور فاطمہ بنت عبداللہ بھی ہیں ان کے نزدیک ہر وہ شخص مثالی ہے جو کردار اور عمل کا مظہر ہو۔

میرا جی ابہام کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں اور نسوانی لہجوں میں بات کرتے ہیں۔ اقبال قطعی بیان حقائق کے شاعر اور توانا لہجے کے مالک ہیں علامت کا استعمال اقبال بھی کرتے ہیں مگر جہاں میرا جی کی علامتیں ان کی بے حد پرائیویٹ زبان کا حصہ ہیں وہاں اقبال کی علامتیں اجتماعی نوعیت کی ہیں اور ان کے انکشاف کے لیے شاعر کے گپ اندھیرے نفس کے اندر بہت کاوش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اقبال زندگی کے شاعر ہیں۔ اور میرا جی زندگی کے بارے میں متشکک شاعر ہیں۔

اقبال ذات کو آفاق کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ مگر میرا جی اقبال کے بعد پہلے بڑے شاعر ہیں، جو اجتماع سے ہٹ کر ذات کے اندر گم ہوئے ہیں۔۔۔ یعنی جنگل میں جا چھپے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ میرا جی بڑی حد تک اقبال کی ضد ہیں یا کم از کم اقبال کے ہم رنگ نہیں یہ بات اگر تسلیم کر لی جائے تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہتا۔ اگر پھر بھی کوئی شخص جھگڑا اٹھائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ میرا جی کی شاعری کی اصل قدر و قیمت سے بھی انکار نہیں کیا جائے کم از کم میں نہیں کرتا، اسی لیے میں جہاں اقبال کو اجتماع اور ملت کا شاعر سمجھتا ہوں وہاں میرا جی کو غم آشنا فرد کا شاعر خیال کرتا ہوں۔ میں میرا جی کی شاعری کو قومی ورثہ بنانے کے حق میں نہیں ہوں یعنی میں اس حق میں نہیں کہ میرا جی کو فرد یا اجتماع کے کردار کی تعمیر پر اثر انداز ہونے دیا جائے مگر میں یہ ہر وقت تسلیم کر دوں گا۔ کہ میرا جی نے اپنے دکھ درد کی اچھی ترجمانی کی ہے، میرا جی ہمارے معاشرے کا ایک روٹھا ہوا غم زدہ شخص تھا لہذا میرا جی کے دکھ کا منکر ہونا سراسر زیادتی ہے۔

آخر ہم میر تقی کو بھی تو بڑا شاعر مانتے ہی ہیں، ہم جانتے ہیں کہ فرد کا دکھ دونوں میں قدر مشترک ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ میر سے لے کر میرا جی تک غم کی ایک سیدھی لکیر ہے جو ہر انسانی دل کے پاس سے گزرتی ہے اور معلوم نہیں میرے جیسے کتنوں کے دل کے پاس سے گزری ہوگی جب صورت یہ ہے تو پھر ایک جوگی بیتا سکھ میرا جی ہی کو ہم زیادہ کیوں کوسیں؟ مگر شرط وہی ہے کہ میرا جی کو صرف اپنے دکھ کی فریاد سمجھا جائے اور اسے کسی فکری مسلک کا رہنما نہ بنایا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرا جی کا دانستہ یا نادانستہ خاصا تتبع ہوا ہے۔ اس میں میرا جی کی شخصیت اور شاعرانہ موسیقی کی بھی کشش تھی مگر کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے اقبال کے مقابلے پر ایک دوسرا مسلک کھڑا کرنے کا ارادہ بھی اس میں شریک رہا یہ اور بات ہے کہ یہ مسلک دیر تک چل نہیں سکا مگر میرا جی کو اقبال کی اسلامی بین الاقوامیت اور اسلامی انسانیت کا نمائندہ اور ترجمان بنانے کی بڑی دیر تک کوشش ہوتی رہی جو خدا کا شکر ہے کہ اب ناکام ہو گئی ہے تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ میرا جی کے نغمے سننے کا شوق ہو تو ضرور سنئے مگر اجتماعی نقطۂ نظر سے کوئی ادبی اور فکری مسلک اگر کسی کا ہے تو وہ اقبال اور فقط اقبال کا ہے

جوش ملیح آبادی

بیادِ اقبالؒ

جناب جوش ملیح آبادی " یادوں کی برات " کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھ رہے ہیں. جس کا بڑا حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس خود نوشت میں حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد بہ عہد افکار و نظریات پر بھی تفصیل سے لکھا ہے، نیز بہت سی اہم ادبی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ جناب جوش نے قومی زبان کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں جوش صاحب کا تجزیہ ان کے شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگ ہے اور اسی لئے بہت " دلچسپ " ہے۔ (ادارہ)

اسی دورِ تصوف و تقشف میں میری سب سے پہلی مصور تصنیف " روح ادب " [1] غالباً سنہ ۱۹۲۰ء یا سنہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی. جس میں میرے بزرگ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی اور میرے دوست رفیع احمد خان کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ اس مجموعے کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی. یہاں تک کہ افریقہ و رنگون وغیرہ سے بھی اس کے آرڈر آئے تھے ـــــ " روح ادب " پر سب سے زیادہ تبصرہ کیا تھا۔ میرے اُس دور کے حبیب اور اِس دور کے حریف مولانا عبدالماجد [3] صاحب دریابادی نے، جن کی محبت کے غلو نے، میرے سے ہیچ مدان نوخیز شاعر کو، غالب و ٹیگور کی صف میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ اور " روح ادب " کی تنقیص پر سب سے پہلے قلم اٹھایا تھا سجاد انصاری [2] مرحوم نے اس وقت ماجد صاحب " کفر " سے منہ موڑ کر پھر اسلام کی جانب آ چکے اور سجاد انصاری حلقہ اسلام سے بھاگ کر " کفر " کی جانب افتان و خیزان

---

[1] اس کتاب پر لاگت آئی تھی۔ چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی. ساڑھے تین روپے فی جلد۔

چلے جا رہے تھے۔ اور یہ ایک رسم بن چکی تھی کہ ادب کے میدان میں وہ دونوں ایک دوسرے کے ممدوح پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔ اسی دوران میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر مجھ کو "روح ادب" کی بہت داد دی تھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ "کوئی شک نہیں کہ آپ کے ساغر تو بالکل نئے ہیں ایسے نئے کہ انہیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر ان ساغروں میں شراب بھری ہوئی ہے۔ وہی پرانی۔ آپ حافظ اور ٹیگور سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ ان دونوں کی شاعری ابھار نہیں پستی پیدا کرتی ہے۔ یہ انسان کو جگاتے نہیں بلکہ تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ آپ حافظ و ٹیگور سے دامن چھڑا لیجئے، فکری اور حر کی شاعری کی طرف آیئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کی بے پناہ خداداد استعداد سے مجھ کو یقین ہے کہ آپ صف اول کے شعراء سے بھی سبقت لے جائیں گے۔ اس وقت میری طبیعت کا دھارا تصوف کے میدان میں بڑے زور شور سے، گونج رہا تھا، اس لئے حضرت اقبال کی نصیحت بزرگانہ کا اثر میں نے قبول نہیں کیا۔

لیکن آگے بڑھ کر، جب میرا مزاج "روح ادب" کے مزاج سے مختلف ہونے لگا۔ اور تصوف سے گزر کر میرے کلام نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اور پھر سیاسی میدان سے آگے بڑھ کر جب میری شاعری تجسس و تشکک کی طرف مڑنے لگی تو اس وقت میرے دل میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ حضرت اقبال ہی کی نصیحت کا اثر اور یہ سب کچھ انہیں کا فیضان ہے، اس لئے کہ ششیدہ اثرے دارد۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اقبال جس نے مجھ کو ٹوکا اور جس روش سے مجھے روکا تھا۔ وہی عظیم اقبال چولا بدل کر۔ حافظ کے راستے پر خود گامزن ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سست عناصر تصوف کے دائرے سے تو صرف نکل آیا اور سلانے کے عوض اس نے چونکانے کی بھی سعی کی۔ اپنی ذاتی و آبائی افتاد مزاج، ماحولی اثرات، اور ہنود[1] کو اپنے جادۂ ترقی کا سنگ راہ پا کر، اس نے ایک ایسا خیمہ نصب کر لیا۔ جس میں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی قناتیں لگی ہوئی تھیں، اور وہ اس خیمے میں بیٹھ کر "اسلام" اے عشق خوش سودائے ما، کا راگ الاپنے لگا۔ اس میں ذہانت بھی تھی، اور حکیمانہ موشگافی بھی۔ اس لئے وہ ایک مدت تک مشرقی ملاؤں، اور مغربی مفکروں کے بین بین بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا رہا اور بہت دن تک مستی کو ہوش پر، اور جنون کو عقل پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اور ایک زمانۂ دراز تک وہ بڑے خلوص کے ساتھ مشرقی ایمان اور مغربی الحاد کے مابین مصالحت کرا دینے کی فکر میں بھی سرگرداں رہا۔ لیکن وہ اپنی

---

[1] افسوس کہ میں کبھی ان سے مل نہیں سکا۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ اگر وہ کچھ اور جیتے تو ہمارے ادب میں ایک قابل قدر فکری اضافہ ہو جاتا۔

[2] جن کے باب میں اس نے کہا ہے، ع "خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ"۔

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

کلام اکبر بنام اقبال

نقیر سید وحید الدین نے گزشتہ چار برسوں میں علامہ اقبال سے متعلق جو چند کتابیں شائع کی ہیں۔ انہیں بجا طور پر اقبالیات میں اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً "روزگار فقیر" جلد دوم میں اقبال کا جو غیر مطبوعہ کلام انہوں نے شائع کیا ہے، وہ ایک ناقابل فراموش علمی و ادبی خدمت ہے۔ اس سلسلے میں سید صاحب نے سہواً اکبر الہ آبادی کی ایک نظم بھی علامہ کے نام سے شامل کر دی ہے۔ "روزگار فقیر" جلد دوم ص ۴۴۔۳۴۳ پر مندرجہ ذیل نظم شائع کی گئی ہے (سات اشعار کی یہ سیاسی نظم کسی مجموعے میں نہیں پائی گئی)

ہے قوم جسم، سلطنت اس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے
سعی شغال و گرگ سے جنبش ہوئی اگر
نافہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے
البتہ زندگانی شخصی کا ہے وجود۔
قانون میں ہر اک کے لئے زندہ باش ہے
پیمانہ ہائے ساختۂ شاہ وقت پر۔
محدود طالبین کی فکر معاش ہے
بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے
کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جز دغیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے
اپنی یہ احتیاط کہ بوسے پر اکتفا
اس پر بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

یہ نظم "قطعہ" کے عنوان سے کلیات اکبر حصہ اول میں (ص ۲۶۷) پر شامل ہے۔ یہ کلیات پہلی مرتبہ اکبر کی زندگی میں الہ آباد سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ کلیات کے بارہویں ایڈیشن میں بھی جو الہ آباد سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا یہ قطعہ شامل ہے۔ سید نقیر وحید الدین صاحب نے اقبال کا جو غیر مطبوعہ کلام شائع کیا ہے۔ وہ انہیں شیخ اعجاز احمد صاحب کی بیاض سے ملا ہے شیخ صاحب نے مختلف اخباروں اور رسالوں سے علامہ اقبال کا کلام جمع کیا تھا۔ ممکن ہے اکبر کا یہ قطعہ اس زمانے میں کسی اخبار میں شائع ہوا ہو اور وہیں سے شیخ صاحب نے نقل کر کے رکھ لیا ہو اور بعد میں انہیں یہ خیال نہ رہا ہو کہ یہ اکبر کا زائدہ فکر ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ محض اس لئے کیا جا رہا ہے کہ "روزگار فقیر" کے آئندہ ایڈیشن میں اس قطعے کو شامل نہ کیا جائے۔ (م۔خ)

(بقیہ ص ۱۲ کا)

اس کوشش میں جب وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تو اس ناکامی کے بعد اس نے نٹشے کے مافوق البشر (SUPERMAN) کو مشرف بہ اسلام کرکے اس کو مرد مومن یعنی "شاہین بچہ" بنا دیا۔ اور قرآن کے مردود۔ رومی کے محبوب لفظ "عشق" کے سر پر "تمام مصطفےٰ" کا عمامہ باندھ دیا۔ اور جب حکیم ممدوح کی عقل نے اسے تیکھے تیوروں سے دیکھا تو اس نے جھلا کر اس کی گردن میں "تمام بولہب" کا طوق ڈال دیا۔

چیست؟ یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما!

داستان زبان اُردو:۔
ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری اُردو کے لسانی مسائل پر کئی گراں قدر مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں "داستان زبان اُردو" ان کا تازہ ترین علمی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے اُردو زبان کے لسانی سرمائے، مختلف نظریوں، مولد و منشا۔ صرفی نحوی نشو و نما، مزاج و منہاج اور ارتقاء کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت: پانچ روپے

وضع اصطلاحات:۔
مولوی وحید الدین سلیم

یہ کتاب اُردو کے نامور انشا پرداز و عالم مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے یہ بالکل نیا موضوع ہے اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے۔

قیمت: پانچ روپے ۷۵ پیسے

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

سیّد عبد الرشید فاضل
صدر شعبہ ادبیات فارسی اردو کالج کراچی

اقبال اور تصوّف

اب[1] ہم اقبال کی تصانیف کا جائزہ لیکر دیکھتے ہیں کہ تصوف کے متعلق مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اُن کے نظریات کیا ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خود ان کی تصانیف میں اُن کے قائم کردہ معیارِ تصوف کی خلاف ورزی موجود ہو۔ اس سلسلے میں اوّل ان کے اُس کلام کو دیکھنا چاہیئے۔ جو اُن کے یورپ جانے سے پہلے کا ہے۔ یعنی ۱۹۰۵ء تک کا کلام۔ ظاہر ہے یہ اُن کا ابتدائی کلام ہے اُس وقت کا جب اُن کا زاویۂ نظر وسعتِ مطالعہ کا محتاج تھا اس لئے اُس زمانے میں ان کے ہاں ملے جلے خیالات پائے جاتے ہیں، وہ بھی جن کی انھوں نے بعد میں سختی سے تردید کی اور وہ بھی، جو بعد میں اُن کے مستقل موضوع بن گئے۔ مثلاً ۔

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ ہی — بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ!
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں؟ — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں۔ ؟

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں!
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں!

ان اشعار میں "وحدۃ الوجود" کا نظریہ موجود ہے۔

اسی طرح ذیل کے اشعار میں بھی یہی رنگ، جھلک رہا ہے۔

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے — حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

میں صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ میخانہ — میں اس میخانۂ عالم میں ہر شے کی حقیقت ہوں

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانہ میں — یہ تصویریں ہیں تیری جنکو سمجھا ہے برا تو نے

---

[1] جناب فاضل "اقبال اور تصوف" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ یہ مقالہ اسی کتاب کا ایک باب ہے۔

وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی کوہکن بھی ہے

جگنو والی نظم میں لکھتے ہیں:

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے

اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

ایک پوری غزل میں شروع سے آخر تک وحدۃ الوجود ہی کا بیان ہے۔

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری، کنارے میں

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل
جہاں میں وانہ کوئی چشمِ امتیاز کرے!

نظارے میں وہ، قمر میں وہ جلوہ گر، سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز کر!

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو!

جو ہے بیدار انساں میں، وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

یا ایسے اشعار ہیں:۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

حالانکہ بعد میں "گوش بند و چشم بند و لب بہ بند" والے شعر کا مذاق اڑایا ہے اور آنکھیں کھول کر کائنات کی ایک ایک چیز کا بغور مشاہدہ کرنے کی تعلیم دی ہے اور مطالعہ فطرت کو معرفتِ الٰہی کی بنیاد قرار دیا ہے:۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

سوامی رام تیرتھ کے انتقال پر یہ اشعار لکھے ہیں۔

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں ہے موتی الا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنئ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیمِ خام ہے

کی ترک تگ و دو و قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

بعد میں نفی ہستی (فنا) اور سکون دونوں کو موت کا مترادف قرار دیا ہے اور اثباتِ خودی اور سعی پیہم کو زندگی سے تعبیر کیا ہے بلکہ اقبال کی بعد کی شاعری کا بیشتر حصہ انہی دو باتوں کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔

یا ایسے خیالات ہیں۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے پردۂ مجبوری و بیچارگیٔ تدبیر ہے

بعد میں تقدیر کے اس مفہوم کی سختی سے تردید کی ہے اور جبر کے بجائے انسانی اختیار کو ثابت کیا ہے اور اس بات کے ذہن نشین کرنے کیلئے بے شمار اسالیب اختیار کئے ہیں۔

لیکن اس دور میں ایسے خیالات بھی موجود ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں اور جو واقعی صوفیانہ خیالات ہیں مثلاً۔

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

وہی خود شناسی کا مضمون ہے جو بعد میں انکا مستقل موضوع بن گیا۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں!

تمنا درد دل کی ہے تو خدمت کر فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں!

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیسا کہ اک نظر میں جوانوں کو رام کرتے ہیں!

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی شان میں فرماتے ہیں۔

ہزارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا!

اہل اللہ کی مذکورہ بالا تعریف میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان حضرات کے فیضانِ صحبت سے ناقص کامل اور کامل رہنما بنتے رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ حضرات خود عشقِ الٰہی میں سرشار ہوتے ہیں اس لئے ان کا عشق دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ذرہ آفتاب اور قطرہ دریا بن جاتا ہے عمر بھر کے گناہوں کی کثافت دور ہو کر انسان کا دل ایک ہی نگاہِ کیمیا سے ایسا پاک ہو جاتا ہے کہ خود پاکیزگی و طہارت کو اس پر رشک آنے لگتا ہے۔ کل تک جو رندِ خرابات نشیں تھا آج وہی ولیوں کا ولی ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

(حافظ)

ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے۔ اور تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مولانا روم ہی کو لیجئے جن کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں۔

پائے در زنجیرِ توجیہات عقل — کشتیش طوفانیِ ظلماتِ عقل
موسیٰ بیگانہ سینائے عشق — بے خبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت — وز حکم صد گوہر تابندہ سفت
عقدہ ہائے قول مشائیں کشود — نور فکرش ہر خفی را وا نمود

لیکن شمس تبریزی کی نگاہِ التفات نے کیا سے کیا کر دیا، اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

یک زمانے صحبت با اولیا — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اور اقبال فرماتے ہیں ع طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے!

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے فیوض و برکات کا کیا کہنا! آپ کے ارادتمندوں کا آپ کی ذات سے اس طرح اکتسابِ فیض کرنا جس طرح ستارے آفتاب سے کرتے ہیں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

یا ایسے اشعار ہیں۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو — کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

جنت کی مذمت نہیں کرتے بلکہ اُس سے بھی بڑی نعمت یعنی دیدارِ الٰہی کی تمنا کا اظہار کر کے اپنی عاشقانہ اولوالعزمی و بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ مضمون قدیم صوفیۂ اسلام کے ہاں بھی ملتا ہے کہ ہم دنیا میں خدا کی خوشنودی اور آخرت میں اُس کا دیدار چاہتے ہیں اور بس۔ ان حضرات کے نزدیک جنت عبادات و ریاضات اور زہد و تقویٰ کی جزا ہے اور دیدارِ الٰہی عشق و محبت کا صلہ۔

یا معرفت و خود شناسی پر مبنی ایسے اشعار ہیں جو حقیقی تصوف کی روح کہے جا سکتے ہیں مثلاً

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو — آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

یعنی معرفتِ خداوندی نفس کشی سے نہیں، نفس کے پہچاننے سے حاصل ہوتی ہے۔

یا ایسے پاکیزہ خیالات ہیں جو تصوف کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اُس کا طالب بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ وہی خیال ہے جو شیخ سعدیؒ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

نیز حضرت ابراہیم ادہمؒ کے ایک خاص واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا۔

یا ایسی قلبی کیفیات کے حامل اشعار:

دلِ بیتاب جا پہونچا دیارِ پیرِ سنجرؒ میں   میسّر ہے جہاں دربانِ دردِ ناشکیبائی

دیارِ پیرِ سنجرؒ سے اجمیر شریف مراد ہے، جہاں خواجہ معین الدین چشتی سنجریؒ کا مزار ہے۔ وہاں ایک مسلمان کو واقعی طمانیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے

یا ایسے اشعار:۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں   بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را!

فقرِ اسلامی کی یہی تعریف ہے کہ گدائی ہو یا بادشاہی، دولت ہو یا افلاس، ایک مسلمان پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہو۔ اور مسلمانوں میں ایسے بادشاہ بھی ہوئے ہیں اور دولت مند بھی جو شاہی دولت کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ایسے بے نوا فقیر بھی ہوئے ہیں جن کے پاس کچھ نہ تھا مگر اُن کے استغنا کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی خیال میں نہ لاتے تھے۔

فقیری ترکِ امارت و ثروت کا نام نہیں ہے بلکہ ہر حال میں خوش اور رجوع الی اللہ رہنے کو فقیری کہتے ہیں۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ "میخِ زر در گِل زدہ ام نہ کہ در دل۔"!

یا ایسے اشعار ہیں:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے   یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے!

شعر کی بنیاد قریب قریب اُس حدیثِ قدسی پر رکھی ہے جس میں فرمایا ہے کہ

"میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور پھر اُس کا کان جس سے وہ سنتا ہے اور آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ جس سے وہ پکڑتا ہے اور زبان جس سے وہ بولتا ہے اور پاؤں جس سے وہ چلتا ہے سب کچھ میں ہی بن جاتا ہوں پس وہ مجھ سے ہی سنتا ہے مجھ سے ہی دیکھتا ہے اور مجھ سے ہی پکڑتا ہے اور مجھ سے ہی چلتا اور بولتا ہے"!

یا ایسے کیف آور اشعار ہیں:۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ   کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا   ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

صوفی کا قول ہے "ما رأیت شیئاً الا رأیت اللہ قبلہٗ" = میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں تو پہلے خدا کو دیکھتا ہوں (اور بعد میں اُس چیز کو) اقبال ایسی ہی نظر چاہتے ہیں کہ جب یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو سجدوں میں لطف آتا ہے کہ آدمی اُس وقت پکار اٹھتا ہے کہ ع

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت!

ایک حدیث بھی ہے کہ فرمایا ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "تو نماز ایسی پڑھ کہ دورانِ نماز میں گویا خدا کو دیکھ رہا ہے" پہلے شعر میں اسی کیفیت کی تمنا کی ہے۔

دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ دل کو آرام و آسائش کا خوگر نہ بنائیے۔ بلکہ صدماتِ عشق سے اس کو پارہ پارہ کر دینے کی کوشش کیجئے کہ

کہ اس آئینے کی قدر خدا کے نزدیک اُسی وقت ہوتی ہے کہ جب یہ اُس کی محبّت کے صدمات سے شکستہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حدیث ہی کا ترجمہ ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا دکھتے ہوئے دلوں میں رہتا ہے۔

تیسرا شعر عراقی کے اس شعر کا کامیاب ترجمہ ہے:-

بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

نماز حضورِ قلب کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اِدھر نیت باندھی اور اُدھر خیالات نے زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دئے۔ یا یہ کہ نمود و نمائش کے لئے پڑھی جائے۔ اولیاء اللہ کی نمازیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ جو حضورِ دل اور خلوص کا مظہر ہونے کی وجہ سے معراج المومنین کا مصداق ہو سکتی ہیں۔

اقبال کے تصوف کی وہ کیفیت جو اوپر بیان ہوئی ۱۹۰۵ء تک رہی اس کے بعد وہ تکمیل تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ وہاں مغربی اقوام کی عملی سرگرمیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی کوشش اور محنت کے نتائج کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا تو مسلمانوں کی تن آسانی، بے عملی اور اس پر ان کی اس درجہ غفلت و بے حسی کے تصور سے ان کو بڑی روحانی تکلیف ہوئی۔ اس بات نے ان کو قرآن میں تدبّر اور تاریخ اسلام کا غائر مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس کم کوشی و بے عملی کے ذمہ دار اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ غیر اسلامی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ تصوّف بھی اس کا ذمہ دار ہے جو ہندی و ایرانی تصوّرات کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ اُن تصوّرات سے جو مسلمانوں سے مغلوب ہونے والی قوموں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے بطور سازش کے ایجاد کئے تھے۔ اس تحقیق کے بعد تصوّف کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ بالکل بدل گیا۔ صحیح تاریخ کا تعیّن تو نہیں کیا جا سکتا مگر اتنا یقینی ہے کہ اسرارِ خودی کی اشاعت کے وقت سے لے کر ان کی آخری تصنیف ارمغانِ حجاز تک جو کچھ انہوں نے تصوّف کے بارے میں لکھا ہے اُس میں یا تصوّف اور صوفیۂ اسلام کی تعریف ہے یا عجمی تصوّف اور پیشہ ور صوفیوں کی مذمت۔ عجمی تصوف کے کسی نظریہ کی بھول کر بھی تعریف نہیں کی ہے۔ بلکہ اسرارِ خودی کے مطالعے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہی وہ ردِّ عمل ہے جو عجمی تصوف کی مضرت رسانیوں کے خیال سے ان کے اندر پیدا ہوا تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:-

"لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے فنا کی تفسیر "فلسفۂ ویدانت" اور "بدھ مت" کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے فنا کی یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں" [1]

اسرارِ خودی

کتاب کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف غیر اسلامی تصوّف کے خلاف مبارزت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی لئے جہاں عجمی تصوف کے نزدیک اپنی ہستی کو مٹانا یا اس کو دھوکا اور فریب سمجھنا انسان کی روحانی ترقی کی معراج ہے۔ وہاں وہ خودی کے اثبات، اُس کی معرفت، تربیت اور استحکام کے اسباب سے بحث کرتا ہے اور ایسے مدلل اور دل نشین انداز میں کرتا ہے کہ نظریۂ فنا مضحکہ خیز بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جس کو دیکھئے یہ راگ الاپتا نظر آتا ہے کہ:-

---

[1] مکاتیب اقبال حصہ اوّل صفحہ ۲۰۳

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ؟

غرضکہ اقبال نے اثباتِ خودی کا وہ صور پھونکا کہ مردہ دلوں کو زندہ اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا۔ کتاب کے آغاز ہی میں فرماتے ہیں:۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی ست   پس بقدرِ استواری زندگی ست

جب کہ حیاتِ عالم زورِ خودی پر موقوف ہے تو جس قدر خودی استوار ہوگی اُسی قدر زندگی بھی استوار و پائدار ہوگی۔ اس بات کو بہت سی لطیف شاعرانہ دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً :۔

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند   ہستیِ بے مایہ را گوہر کند

کوہ چو از خود رود صحرا شود   شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود

یہاں تک کہ :۔

چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست   می کشاید قلزمے از جوئے خویش

ویدانت اور بدھ مت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کر کے خدا میں مل جانا اور خدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے ویدانتیوں اور بدھ مت والوں کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تمناؤں اور مقاصد کی نفی کرتے ہوئے بالآخر بے مقصد و بے مدعا ہو جائے یہی بات عجمی تصوف کہتا ہے۔ مذکورہ بالا فلسفوں میں یہ بات اس وجہ سے بھی ضروری سمجھی گئی کہ ان کے نزدیک یہ جہان ایک نمودِ بے بود یا فریب اور اک یا آرزو کی پیداوار ہے۔ اور وجود ایک برائی ہونے کی وجہ سے شر اور ذکر تکلیف سے لبریز ہے۔ اس لئے نجات کا ان کے نزدیک ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان بے آرزو ہو جائے :۔

گر تجھ کو یقینِ اجابت دعا نہ مانگ   یعنے بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

اور اس اعتبار سے بے مدعا ہونا انکی آخری منزل ہے :

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے   دلِ بے مدعا دیا تو نے

اقبال فرماتے ہیں کہ زندگی اور جہان آرزو کی پیداوار ہیں تو آرزو کی نفی کرنی چاہیئے یا زندگی کو تمام آلام و مصائب کے باوجود ایک نعمت سمجھتے ہوئے تولید آرزو کے ذریعہ اس کو وسعتوں سے ہمکنار اور رفعتوں سے مالا مال کرنا چاہیئے؟ فرماتے ہیں مومن کو تخلقوا باخلاق اللہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے اندر صفتِ خلاقی کا کمال پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاکہ اُس کا نائبِ حق اور خلیفۃ اللہ ہونا ثابت ہو جائے۔ اور تخلیق کے لئے آرزو کا ہونا ضروری ہے۔ بلکہ آرزو نو بنو اور تمنائیں بوقلموں ہونی چاہئیں۔

زندگانی را بقا از مدعا ست   کاروانش را درا از مدعا ست

آرزو را در دلِ خود زندہ دار   تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا   سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

زندہ را نفی تمنا مردہ کرد　　　شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

مقاصد و مدعا کا وجود انسان کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسا شعلے کے لئے حرارت۔ حرارت نہیں تو شعلہ کہاں! اسی طرح انسان کی زندگی بھی بغیر تمنا اور تولیدِ مقاصد کے بغیر ممکن نہیں۔ مقاصد نو بنو ہوں۔ اور انکے حصول کے لئے سعی پیہم کی جائے تو خودی کا اثبات ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی استحکام بھی۔ اسلام نے آرزو شکنی اور تمنا کشی کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ اُن کے حدود کا تعین کر کے ان کے حصول اور اُن سے زندگی کو خوش گوار بنانے کا طریقہ بتلا دیا ہے۔ آرزو پاکیزہ اور مقاصد بلند ہیں تو وہ خودی کے استحکام، روحانی قوت، ترفع اور خدا کی خوشنودی کا باعث ہیں۔

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات　　　غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
چون ز تخلیقِ تمنا باز ماند　　　شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی　　　موجِ بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند　　　دفترِ افعال را شیرازہ بند

اقبال نے جہاں آرزو کی تعریف کرتے ہوئے اس کو صیدِ مقاصد کے لئے کمند اور دفترِ افعال کا شیرازہ بند قرار دیا ہے وہاں یہ بھی بتلا دیا ہے کہ آرزو کیسی ہونی چاہئے اور مقصد کیا ہونا چاہئے۔ فرماتے ہیں۔

مقصدے، مثلِ سحر تابندۂ　　　ما سوا را آتشِ سوزندۂ
مقصدے، از آسماں بالا ترے　　　دلربائے، دلستانے، دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارت گرے　　　فتنہ در جیبے سراپا محشرے
ما ز تخلیقِ تمنا زندہ ایم　　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اسکے بعد ایک عنوان ہے "خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد"

عجمی تصوف میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے عشق کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی محبوب کی یاد میں ایسی محویت کہ دنیا و مافیہا کو طاق نسیاں پر رکھ دیا جائے۔ یہ عشق تجریدی و تنزیہی ہو کر عاشق کو کسی اور سے محبت تو کجا کسی کے خیال و تصور کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اس میں دوئی حرام ہے اسی لئے موجودہ زمانے کے صوفیوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کی تعبیر لا موجود الا اللہ سے کی ہے اور غیر اللہ کے تصور کو بھی شرک قرار دیا ہے۔

چندا ز موذن بشنوم توحیدِ شرک آمیز را　　　کو عشق تا یکسو نہم شربۂ خلاف انگیز را　　　(نظیری)

عشق خدا، عشق رسول یا عشق شیخ کا ایک ہی مفہوم ہے کہ خدا، رسول یا شیخ کے خیال میں ایسا گم ہو جائے کہ اور کسی کا تو کیا ذکر اپنا بھی ہوش نہ رہے غرضکہ عجمی تصوف میں عشق فعال اور خلاق نہیں ہے محویت میں خلاقی کیسی، پھر یہ محویت خلوت چاہتی ہے جس سے رہبانیت پیدا ہوتی ہے۔

عجمی تصوف میں "تنازع للبقا" کو عشق کے منافی قرار دیا ہے حالانکہ یہ مصافِ ہستی خود عشق کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے عشق ہی سے زندگی عالم وابستہ ہے اور عشق ہی سے انسان کی خفتہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور مردہ جذبات زندہ ہوتے ہیں۔ عشق کسی انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ کمال درجہ کی فعلیت کا مالک ہے۔ کائنات کی تسخیر عشق ہی سے ہو سکتی ہے۔ پھر عشق اپنے تاثر اور فعلیت کے ساتھ ساتھ　　　بھی انتہا درجے کی رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسان رموزِ کائنات سے آگاہ، اسرارِ خودی سے واقف اور عقلِ عیار کی حکومت سے آزاد ہوتا ہے۔ اور اعمال کی زشتی و بد نمائی

کو حسن و جمال سے بدلتا ہے لیکن عجمی تصوف عشق کی ان صفات کا قائل نہیں ہے مولانا روم نے عشق کی تعریف میں بڑی وسعت پیدا کی ہے مگر اقبال نے اس میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ اس سے زیادہ کی کسی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اقبال نے جس کیفیت کا نام عشق رکھا ہے اس کے مظاہر کی گوناگونی کی کوئی حد نہیں ہے اور جہاں اس کے مظاہر بے شمار ہیں وہاں وہ ہر جگہ ایک اور ہی رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اقبال چاہتے ہیں کہ عشق کو خلوت سے نکال کر خارجی فطرت کا رمز آشنا اور دنیائے فکر و نظر میں انقلاب برپا کرنیوالا ہونا چاہیئے:-

اندکے اندر حرائے دل نشیں ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو، سوئے خود گام زن لات و عزائے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق؛ جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا

شرحِ انی جاعل سازد ترا

اقبال خلوت نشینی کو برا نہیں کہتے بلکہ اُن کے نزدیک تو خلوت میں روح اور عشق دونوں کی پرورش ہوتی ہے مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس باطنی تربیت کا نتیجہ جلوت میں ظاہر ہونا چاہئے تاکہ اُس سے شخصی اور قومی زندگی میں انقلاب آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ خلوتِ حرا میں گزارا اور نبوت کے بعد بھی انتہائی کثرت مشاغل کے باوجود بھی رات کی خاموشی میں خلوت کی تنہا نشینی کو مترک نہیں کیا۔ لیکن وہ خلوت ایک زبردست قوم، ایک آئین حیات اور حکومت کے وجود میں آنے کا باعث ہوئی۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید

لہذا خلوت نشینی کا مقصد نورِ ذات سے مستنیر ہو کر قوموں کی زندگی اور افراد کی سیرتوں میں انقلاب پیدا کرنا اور زندگی کے فرسودہ طریقوں کو ختم کر کے اس کی اقدار کو تقدیرِ نو سے آراستہ کرنا ہے۔ خالی محویت اور خلوت نشینی، روحانی لذت اندوزی میں گرفتار کر کے قوم کی عملی زندگی کو فنا کرنے کے سوا اور کس کام کی ہے؟ خودی کے اندر لامتناہی امکانات پوشیدہ ہیں۔ خودی کو محکم کرنے کے لئے اُن امکانات کو قوت سے فعل میں لانا ضروری ہے اور یہ بات اُسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب امکاناتِ خودی کی معرفت کے ساتھ ساتھ اس کو محبوب بھی بنایا جائے کہ محبوبیت ہی ان کو ظہور میں لانے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور امکاناتِ خودی کے ظہور میں آنے ہی سے افراد اور قوموں کی زندگی میں انقلاب آتا اور حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت چشم اگر داری بیا بنمایمت

عاشقانِ او ز خوباں خوب تر خوشتر و زیباتر و محبوب تر

خاک نجد از فیض او چالاک شد آمد اندر وجد و بر افلاک شد

اقبال فرماتے ہیں کہ خودی ایک اور طریقے سے بھی استوار ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جن ہستیوں نے اپنی خودی کے ممکنات کو بروئے کار لا کر اپنے آپ کو فرشِ خاک سے افلاک پر پہنچا لیا ہے اُن سے عشق یعنی اُن کی صحبت میں رہ کر ان کا رنگ اختیار کیا جائے۔ تاکہ ان کی طرح اپنے ممکنات کی تربیت و واقفیت اور عشق پیدا ہو اور اس طرح ماحول کو بدل کر ایک زندگی بخش انقلاب لایا جا سکے جس طرح مولانا روم نے شمس تبریز

کی صحبت سے اپنی خاک کو اکسیر بنایا تھا جس کے متعلق مولانا خود فرماتے ہیں

مولوی ہرگز نشد مولائے روم ... تا غلام شمس تبریزی نشد

اقبال فرماتے ہیں:-

عاشقی آموز و محبوبے طلب ... چشم نوحے قلب ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے ... بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را ہمچو رومی بر فروز ... روم را در آتشِ تبریز سوز

عشق کی تکمیل کے لئے ذکر اور فکر دونوں ساتھ ہونے چاہئیں، جہاں نفس میں غوطہ لگانا ضروری ہے وہاں آفاق کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور خدا کی مخلوق سے بھی محبت کرنی چاہئے۔ کہ مخلوقِ خدا سے محبت بھی خدا ہی سے محبت ہے۔

عشقِ رسول سے مراد تقلید و اتباع ہے۔ مگر تقلید ایسی ہونی چاہئے جیسی حضرت بایزید بسطامیؒ نے کی؛ ایسی تقلید میں عشق اپنے کمال پر پہونچکر اپنے ماحول میں انقلاب برپا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

کیفیت با خیزد از صہبائے عشق ... ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کاملِ بسطام در تقلید فرد ... اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار ... تا کمندِ تو شود یزداں شکار

"حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انھیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے" (اقبال) (باقی آئندہ)

قاموس الکتب :- بابائے اردو

کتابوں سے متعلق یہ کتاب انجمن کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جو کئی جلدوں میں مکمل ہوگی۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں جتنی بھی کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی یہ مکمل فہرست ہے۔ تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں جو ۳۰×۲۰/۸ سائز کے چودہ سو (۱۴۰۰) صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔ قیمت چالیس روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ کراچی ۱

نربھے رام جوہر

حالی، اکبر اور اقبال

اپنے نظریات اور افکار کے تنوع کے لحاظ سے حالی، اکبر اور اقبال کو مختلف ناقدین نے ادوار کے خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ حالی حال کے، اکبر ماضی کے، اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں۔ ناقدین سخن کی اس رائے کے پیش نظر اگر دیکھا جائے تو اکبر کے یہاں ماضی سے قربت کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ مثلاً وہ مذہب، تعلیم اور معاشرت کے لئے سر سیّد تحریک کو قطعی بے معتبر اور ضرر رساں تصوّر کرتے تھے ان کا نظریہ تھا کہ مذہب اور مشرقی اقدار سے بے نیاز ہو کر ہندوستانی کسی نصب العین کو نہیں پا سکتے۔ انھیں چاہیئے کہ مذہب کو مقدم تصور کریں انگریزی تعلیم کے خطرناک نتائج اور اثرات سے بچیں اور مغربی تہذیب سے پہلو تہی کریں۔ انھیں خیالات کی تبلیغ کے لئے اکبر نے جا بجا سر سیّد تحریک، مغربی تہذیب، بے پردگی اور تعلیم نسواں وغیرہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہی ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ مغرب سے دوری اور مشرق پرستی کے نظریات رکھتے ہوئے بھی اکبر کے یہاں فکر و عمل کا تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ خود فرنگیوں کی ملازمت میں تھے ان کے گھر میں بھی مغربیت گھر کر چکی تھی اور خود اپنے صاحب زادے عشرت حسین کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ فکر و عمل کے اس تضاد سے قطع نظر اپنے خیالات کے اعتبار سے اکبر ماضی سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں حال اُن کی نظر میں بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے یا یوں کہیئے کہ وہ ماضی میں اتنے کھوئے رہتے ہیں کہ حال کے متعلق کچھ نہ سوچا ان افکار و نظریات کی بنا پر انھیں قدامت پسند کہا جا سکتا ہے بعض ناقدین انھیں نفسیاتی طور پر بیمار سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ حال کے تقاضوں سے انکار اور ماضی کی گمشدہ جنت کی تلاش ایک قدامت پسند کی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے۔

کلام اکبر کی اس ماضی نمائی کے باوجود اکبر کو ایک طرح سے حال کا شاعر کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ ان کا کلام ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس زمانے کی تمدنی تحریکیں، سیاسی انقلاب، مذہبی عقیدے، معاشرت کے طور طریق اور رسوم و روایات غرض سب کچھ روشن نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ بقول ایک نقاد "قومی تاریخ ناپید ہو جائے تو وہ صرف اکبر کے کلام سے حاصل کی جا سکتی ہے" اس بیان کی تائید میں ذیل میں چند سیاسی تحریکات اور واقعات پر اکبر کے شعری تبصرے درج کیے جاتے ہیں۔

دربار دہلی منعقدہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء	۵ محفل اُن کی ساقی اُن کا	آنکھیں میری باقی ان کا
یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۰۴ء	دستِ فلک سے ہند کی خلقت بہت پٹی	
	جو کچھ تھی اس کی عظمت و رفعت وہ سب مٹی	

اس کی دُوا قناعت و نیکی ہے بس فقط
تھا مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی

مئی ۱۹۱۵ء میں محمد علی، شوکت علی، آزاد اور حسرت کی گرفتاری پر۔ ۔ ۔ ۔

بیا در بنجِ یارانِ نظر بند — کیا ہم پر بھی ہو ملنے کا در بند
ہماری ہے کسی کب تک چھپے گی — خدا پر تو نہیں راہِ خبر بند

پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کے جیت جانے پر۔

برخلاف انگلش کے اب یورپ میں یکتا کون ہے ؟
جس سے ہم ہارے ہیں اُس سے جیت سکتا کون ہے

اکبر کے بعد جب حالی کے کلام پر نظر جاتی ہے تو ایک دوسری ہی دنیا نظر آتی ہے ان کے یہاں فکر و عمل پر پوری طرح سر سید تحریک چھائی ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افکار و نظریات کے اعتبار سے سرسیّد اور حالی کو الگ نہیں کیا جا سکتا جس طرح سرسیّد کی نظر ہر وقت حال پر رہی اسی طرح حالی بھی اپنی نظریں حال پر جمائے رہے ان کا بھی نظریہ تھا کہ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو ایک مردہ قوم کے لیئے تازیانہ عبرت کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا وہ مسلمانوں کو اس راہ پر لانے کے خواہاں تھے۔ جس پر چل کر وہ انگریزوں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ چاہے اس راہ میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں۔

حالی کے قومی شعور اور شاعرانہ مسلک پر تبصرہ کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔

” ان کی شاعری ہم کو محض ہماری گزری ہوئی عظمتوں کی یاد دلا کر ہمارے اندر حرکت اور بیداری کی علامتیں پیدا کرنے میں تو کامیاب رہی مگر انقلاب اور ترقی کا کوئی واضح اور قطعی تصوّر پیدا نہ کر سکی۔

(اقبال، طبع اوّل از مجنوں گورکھپوسی صفحہ ۵)

اور ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں :۔

” مستقبل کا ان کے سامنے کوئی تصوّر ہی نہیں تھا کیونکہ سامنے دیکھنے کے لئے جس اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں ختم ہو چکا تھا۔“

(حالی کی شاعری، صفحہ ۹۳)

مذہب۔ معاشرت اور تعلیم کے لیئے سرسید، خطرناک حد تک جدید تصوّر رکھتے تھے۔ حالی نے بھی اسی تصوّر کو اپنایا۔ اور ہندوستانی مسلمان کو مغربی تہذیب اور تعلیم سے قریب لانے کی کوشش کی مگر اس طرح کہ وہ کلیتہً مذہب سے بے گانہ نہ ہو جائیں انھیں کیا معلوم تھا کہ اکبر کی درس گاہیں تعلیم کے جو اثرات دیکھ چکی ہیں وہ صحیح ثابت ہو جائیں گے۔ سرسید بھی اپنی زندگی کے آخری دور میں تحریک کے غلط نتائج سے باخبر ہو چکے

تھے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ وہ تمام حقائق ہیں جن سے حالی کا سابقہ پڑا۔ . . . لیکن وہ پھر بھی اپنی بات پر قائم رہے اور مسلمانوں کو ان کے ماضی کی اشاراتی جھلک دکھا کر حال پر نظر ڈالنے کی تلقین کی۔ ان کی پوری قومی شاعری ان ہی رجحانات کی آئینہ دار ہے یعنی سر سید تحریک کی حمایت، انگریز حکومت کی مداحی اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر اشک باری۔ ان تمام احساسات، نظریات اور جذبات کا منبع حالی کی شاعری ہے جو مجسم حالی کی عکاس ہے لیکن ماضی کے مدھم نقوش لیے ہوئے۔

قومی شاعری کے آئمہ ثلاثہ میں حالی اور اکبر کے بعد اقبال کا نام آتا ہے جو فکر و نظر کی شعوری عظمت کی بنا پر حالی اور اکبر سے بہت آگے ہیں، انھوں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جسے حالی اور اکبر کی نگاہیں نہ دیکھ سکیں۔ شاید اسی لیے ان کے نظریات ہمہ سمتی انداز کے حامل ہیں، انھوں نے اکبر کے ماضی کو بھی گلے لگایا۔ حالی کے حال کو بھی چاہا اور ایک خوش آیند مستقبل پر بھی نظر کی۔ . . . وہ اس اعتبار سے پہلے شاعر تھے جنھوں نے مسلمانوں کو ماضی اور حال سے گھڑی بھر کے لیے ہٹا کر مستقبل کی راہیں دکھائیں۔ . . . "شکوہ" میں ماضی پنہاں ہے "جواب شکوہ" حال کا آئینہ دار ہے اور "خضر راہ" مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔ اپنے ان نظریات کی بنا پر اقبال خود مصر ہیں کہ انھیں مستقبل کا شاعر کہا جائے۔

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم
من نوائے شاعر فردا ستم

اقبال نے مسلمانوں کو مستقبل کے لیے جس لائحہ عمل اور نصب العین کی جھلک دکھائی اس کا واضح خاکہ ان کے فلسفہ خودی، فقر اور مرد مومن میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے زندگی کی ہر منزل پر یہ چاہا کہ حصولِ آزادی کے لیے مسلمان عظمتِ کردار کا ثبوت دیں اور کامل انسان بن کر دکھائیں۔ جس کے لیے انھوں نے مرد مومن کا حیات افزا نظریہ پیش کیا اور اس کے اوصاف کی نشان دہی کے لیے خودی، فقر اور عشق کے عظیم نظریات پیش کیے جن کے مطالعے سے اقبال کو ہم بلا شبہ مستقبل کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔

حالی، اکبر اور اقبال پر مجموعی حیثیت سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اکبر ہر ترقی سے کچھ بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں حالی کے نزدیک روایات زیادہ اہم ہیں۔ کسی بغاوت کی ضرورت نہیں۔ اقبال کے یہاں فکری عنصر زیادہ ہے۔ وہ حال کا ذکر بھی مستقبل کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ ان تینوں شعرا کے نظریات کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اکبر :— لوٹ ماضی کی طرف اے گردش ایام تو۔

حالی :— زمانہ با تو نہ سازد تو بہ زمانہ بساز۔

اقبال :— زمانہ با تو نہ سازد تو بہ زمانہ ستیز۔

اکبر خالص مشرقی ہیں حالی پیروی مغربی پہ ناز کرتے ہیں اور اقبال مشرق اور مغرب دونوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور دونوں کی خوبیوں کو اپنانے کا پیغام دیتے ہیں۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

کلام اقبال میں مستقبل کا جلوہ چند وجوہ کا رہین منت ہے سب سے پہلے تو یہ کہ اقبال ایک مفکر اور مدبر کا ذہن لیکر پیدا ہوئے تھے جبکہ اکبر اور حالی اس خصوصیت سے محروم تھے دوسرے اکبر اور حالی کو جو دور ملا جو قوم ملی وہ اپنی بدحالی سے بے نیاز نہتی جبکہ اقبال کو وہ دور ملا جب ہر فرد اپنی زبوں حالی کا احساس رکھتا تھا تیسرے اکبر اور حالی نے صرف ہندستان دیکھا تھا جبکہ اقبال نے دنیا دیکھی تھی ان وجوہات کی بنا پر نظر اقبال کی مستقبل شناسی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

انجمن کی مطبوعات

پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری	بابائے اردو	۵-۵۰ روپے
وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	۷-۰۰ "
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ "
کیفیہ	پنڈت برج موہن وتاتریہ کیفی	۴-۵۰ "
سیّد احمد خاں، حالات و افکار	از بابائے اُردو	۴-۰۰ "
غالب، فکر و فن	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۵-۰۰ "
تلخیص الاردو (رسالہ "اُردو" کا انتخاب)		۵-۵۰ "
مقالات گارساں دتاسی حصہ اوّل		۱۰-۰۰ "
اُردو تھیٹر (تین جلدوں میں)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی قیمت فی جلد	۷-۰۰ "
سعادت یار خان رنگین (حالات و کلام)	ڈاکٹر صابر علی خاں	۵-۷۰ "
محمد حسین آزاد (جلد اوّل۔ حالات)	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۸-۰۰ "
محمد حسین آزاد (جلد دوم) ادبی کارنامے	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵-۰۰ "
جلال لکھنوی۔ (حالات و انتخاب کلام)	ڈاکٹر محمد حسن	۳-۰۰ "
سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۶-۵۰ "
سودا۔ (حالات اور تبصرہ بر کلام)	شیخ چاند مرحوم	۷-۰۰ "
نیا ادب	پنڈت کرشن پرشاد کول	۴-۵۰ "
آرٹ ان اردو پوئٹری (انگریزی)	شہاب الدین رحمت اللہ	۶-۷۰ "
فن شاعری (بوطیقا) ارسطو	مترجم پروفیسر عزیز احمد	۲-۵۰ "

ڈاکٹر محمود الٰہی

مقدمۂ تذکرۂ شورش

شعرائے اردو کے تذکروں میں "تذکرۂ شورش" کی صرف اس لحاظ سے اہمیت نہیں کہ اس کا شمار ہمارے ابتدائی تذکروں میں ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلا تذکرہ ہے جو عظیم آباد میں لکھا گیا اور اس سے وہ نقوش ظاہر ہوتے ہیں جنہیں ترتیب دے کر یہاں کے ابتدائی شعری ماحول کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔

یوں تو اس تذکرے کا حوالہ یہاں ملتا رہا ہے لیکن تحقیقی کام کرنے والے کبھی اس سے بھرپور استفادہ نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے صرف ایک قلمی نسخے کا علم تھا جو بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے، جنہیں تنقید و تحقیق سے یکساں شغف ہے۔ اس نسخے کو شائع کر کے اردو کی بڑی خدمت کی۔ لیکن اس کی اشاعت نے اس کے ثقہ اور مستند ہونے کو ایک مستقل سوال بنا دیا ہے۔ کیونکہ اس میں جہاں شورش کا ذکر ہے۔ وہاں ایسے الفاظ استعمال میں لائے گئے ہیں جنہیں بڑے سے بڑے برخود غلط لوگ بھی شاذ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

"شورش، سید غلام حسین عرف بھینا۔۔۔۔ شعر بہ فصاحت و سلامت تمام می گوید۔ غزل در طرفۃ العین انجام می نماید۔ قصیدہ و مثنوی و رباعی بہ شستگی و رفتگی رقم پذیری می سازد۔ مذاق صوفیہ دارد۔ اکثر شعر ہم بمذاق صوفیہ فرماید، کلیاتش مرتب چہار ہزار شعر بہ نظر در آمدہ۔۔۔۔۔"

حال ہی میں راقم سطور کو تذکرۂ شورش کا ایک اور مخطوطہ دستیاب[1] ہوا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آکسفورڈ والے مخطوطے میں کسی نہ کسی حد تک تحریف ہوئی ہے، اس نسخے میں شورش کے ذکر میں اشعار سے پہلے صرف ان کا نام ملتا ہے آکسفورڈ والے نسخے کی عبارت اس میں نہیں ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شورش کے کسی عقیدت مند نے شورش کا ترجمہ لکھا ہے۔

---

(۱) میں خانقاہ رشیدیہ، جون پور کے متولی جناب سید ہاشم علی سبز پوش رئیس گورکھپور کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس نسخے سے استفادے کا موقع مجھے دیا۔

اس نسخے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شورش کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس سے تحقیق کی بہت سی راہیں کھل گئی ہیں۔ اس مقدمہ کو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں شورش نے عظیم آباد میں شعری ماحول کا خاکہ پیش کیا ہے اور اپنی علمی و ادبی مصروفیات کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں انہوں نے تذکرے کے سبب تالیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے، اور تیسرے حصے میں وہ بیانات آتے ہیں جو شعر کی اہمیت و ماہیت اور اس کے اقسام پر مشتمل ہیں۔ یہ تینوں حصے اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ تذکرے کے سلسلے میں جو نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) اس کا نام رموز الشعراء ہے۔

(۲) اس کی ترتیب شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا کے ایما سے عمل میں آئی۔ وہ بالخصوص تذکرۂ میر سے مطمئن نہیں تھے اس لئے چاہتے تھے کہ ایک بہتر تذکرہ لکھا جائے۔

(۳) مرتب کا مقصد یہ تھا کہ شعرائے ہندوستان کے ساتھ شعرائے بہار کا بھی ذکر کیا جائے۔

مقدمے کے متعلقہ اقتباسات یہ ہیں۔

"بعد نادر شاہی میر باقر موصوف از شاہ جہاں آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردہ۔ گفتگوئے شعر و شاعری بطور مرزا موصوف رواج یافتہ۔ بہ تفصیل برادر گرامی قدر میر محمد رضائے جرأت کہ فاضل بودند، زدہ تشر د نظم مہارت کمال داشتند دگاہے غزل فارسی بہ مشورہ نتیجہ صاحب می فرمودند۔ میلان طبیعت احقر طرف ریختہ آمدہ غزل گفتہ۔ بعد ازاں برادر منظور ایں حامی را بہ میر باقر مذکور سپرد فرمودہ تا بیت غزلی اصلاح از میر باقر موصوف گرفتہ۔

بعدہ مزاج احقر مائل طرف مثنوی شد۔۔۔۔ مثنوی شب ؤ مثنوی درد و الم و باغ و بہار گفتہ۔ بعدہ میر باقر و میر محمد رضائے جرأت رخصت از عالم فانی بہ عالم جاودانی نمودہ۔ صحبت شعر و شاعری برہم خوردہ و زندگی بہ ملاوت گردیدہ۔

بعد یک سال مزاج درست دیجا شدہ و مثنوی سوم در تالیف علی باغ مشتمل بر مدح حضرت مولوی محمد وحید باتمام رسانیدہ و گاہے غزل ہم میگفتند و دیوان خود دومی ساختہ۔

درایں ضمن خمسہ مرزا محمد رفیع سودا سلمہٗ تعالیٰ کہ ایں مصرع یقین غفر کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے: مصرع پنجم او بودہ۔ شہرت دریں یافتہ، بعدہ غزل مرزا و اشعار حضرت خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیدہ و شہرت یافتند طرز سخن بطور دیگر گردیدہ۔

حسب اتفاق در صوبہ داری محمد کاظم خاں بہادر احترام الدولہ۔۔۔۔ محفل مشاعرہ بروز جمعہ قرار یافتہ۔۔۔۔ میر غلام علی اظہر گفتہ کہ شاہ رکن الدین عرف حضرت میرزا گھسیٹا صاحب مد ظلہٗ از مرشد آباد ترک روزگار نمودہ بہ عظیم آباد تشریف آوردہ اند۔ اگر دریں محفل مشاعرہ آیند احسن است۔ احقر ہمراہ میر مذکور رفتہ، ملازمت نمودہ۔ از راہ نوازش

قبول فرمودند تا محفل مشاعرہ کم از کم یک سال نماندہ تشریف مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غفرلہ ارزاں می فرمودند۔

چوں تفصیل آں حضرت در دل این، جا یافتہ و محفل مشاعرہ بہ جہت ماہ مبارک رمضان برہم خوردہ، احقر بیشتر بہ خدمت حضرت مرزا صاحب می رفت، درآں وقت اکثر مردم مثنوی حضرت مولوی روم و لمعات و شرح رباعیات مولوی حاجی نور مرقدہ می خواندند۔ ایں عاصی ہم از دور سماعت می نمود۔ وسوا ازیں ہر چہ ارشادی فرمودند آں را بطور ملفوظ می ساخت۔

روزے ارشاد شد کہ شخصے[1] در تذکرہ خود یک شعر آں قصیدہ مرزا رفیع سودا نوشتہ است۔

دیگر در دل خطرہ گزشت کہ دراں ایام طبیعت احقر مصروف بہ تالیف نیست۔ چنانچہ اول ارشاد العارفین تالیف نمودہ بعدہٗ احوال بادشاہان ہندوستان از ...... تا وقت جلوس شاہ عالم نوشتہ۔ بعدہٗ ملفوظات حضرت پیر دستگیر قمر الحق قدس سرہٗ کہ مسمٰے بہ گنج فیاضی است منتخب ساختہ و بعدہٗ در شرح ایں حضرت شاہ نعمت۔ ہر چہ پیدا و ہر چہ پنہاں است۔ جملہ در یک وجود انسان است چوں ازیں فرصت یافتہ در اصلاح دیوان مصروف گشتہ چنانچہ بہ اصلاح حضرت مرزا صاحب درست ساختہ اما بہ باعث پریشانی کارے کمال دریں فن حاصل نہ کردہ۔ حسرت علم در دل ماندہ۔ روزے حضرت مرزا صاحب ارشاد فرمودند کہ مردماں کاہ را کوہ و کوہ را کاہ می نمایند، اشعار ہر یک بہ طرز ہر یک نمی نوشتند۔ اگر شما تذکرہ می نویسید بہ خوب است۔ در دل خطرہ گزشت کہ طاقت انتخاب تا حال تحریر بہم نہ رسیدہ است ...... چنانچہ فرمودہ شعر گفتن گرچہ در سفتن بود۔ لیک فہمیدن بہ از گفتن بود۔ وشاید حضرت برآں تربیت ایں عاصی می فرمایند کہ بہ سبب استقلال ایں کار ہم پیدا خواہد شد۔

امر عالی را سعادت دراین تصور نمودہ تحریر ... والا نہ ایں ہیچمداں را دریں فن چہ شعور و چہ مقدور کہ دم زند......

"در ہندوستان اکثر بزرگان تذکرہ نوشتہ اند و اشعار شاعران قدیم و جدید بقید قلم آوردہ اند مگر دریں شہر گاہے کسے تذکرہ فارسی ہم نہ نوشتہ چہ ہندی ..... بنا بریں محنت بر خود اختیار نمودہ کہ احوال و اشعار شاعران ایں جامع اشعار شاعران ہندوستان بقید قلم آوردکہ در زمانہ حال و استقبال یادگار د۔ واگر شاید بہ سمع کسے اہل دل برسد و خوشدل او شود یک گونہ باعث نجات ایں عاصی بود و احقر دریں کلام ہر گز ارادۂ انشا نہ کردہ است۔ اگر جائے سہو و خطائے باشد معاف فرمایند کہ ہیچ بشر خالی از خطا نبود۔ و ہر تصنیف را نام لازم است لہٰذا نام ایں تذکرہ "رموز الشعرا" داشتہ و اگر تذکرہ شورش ہم گویند مضائقہ ندارد۔ و بطور حروف تہجی مرقوم ساختہ و بہ طول طویل نہ پرداختہ"

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تذکرہ نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا لیکن مصنف کے سامنے یہ مقصد ضرور تھا کہ میر کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے اور ان کے تذکرے پر اضافہ کیا جائے۔ نکات الشعراء کے مقابلہ میں رموز الشعراء نام رکھنا بھی اسی رجحان کی توثیق کرتا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ میر نے اپنے تذکرے کے آخر میں شعر کے اقسام بتائے ہیں، شورش نے بھی یہ راستہ

---

(۱) غالباً نکات الشعراء کی طرف اشارہ ہے جس میں "تضحیک روزگار" کا صرف ایک شعر نقل ہوا ہے۔

اپنایا ہے۔ اور میر کے بیانات پر گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ میر نے شعر کی چھ قسمیں بتائی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہیں پیش کی ہیں، شورش اس کی دس قسمیں بتاتے ہیں۔ اور فارسی اور اردو اشعار سے ان کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ انہیں غلط نہ سمجھا جائے۔ عربی و فارسی حروف و افعال ریختہ میں کس طرح استعمال کئے جائیں۔ یا ان کی بندشوں اور ترکیبوں کا طور طریقہ کیا ہو۔ ان سوالات پر شورش نے جو بحث کی ہے اسے اردو میں قواعد سازی کی ابتدائی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شورش کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعراء کے کلام پر بڑے اعتماد کے ساتھ آزادانہ اور بے باک رائے دیتے ہیں۔ تنقید کا یہ فن انہوں نے حضرت رکن الدین عشق سے سیکھا جو بلا شبہہ عظیم آباد کے عالموں۔ صوفیوں، اور شاعروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس زمانے میں خانقاہوں کو علم و ادب کے ایک مرکز کی بھی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ یہ امکان خارج از بحث نہیں کہ انہوں نے کسی شاعر کے مقام کا تعین حضرت عشق کے مشورے سے کیا ہو۔ شورش کی عمر کا آخری بڑا حصہ تصوف کی وادیوں میں گزرا۔ وہ حضرت عشق کے ارادت مندوں اور متوسلین میں تھے۔ وہ تذکرے میں گمنام مگر صوفی شعراء کا ذکر بھی بڑے احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب تک شورش اور ان کے تذکرے کا مطالعہ اس زمانے کی تحریک تصوف کو سامنے رکھ کر نہیں کیا گیا۔

(۲)

اس نسخے کے کم از کم دس سال بعد اوکسفورڈ والا نسخہ لکھا گیا۔ جس کے ثبوت میں دونوں نسخوں کے یہ بیانات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

قلندر، شاہ غلام قلندر (نسخۂ اوکسفورڈ) :"..... قریب سی سال است کہ بہ طرف دہلی می باشند....."

(نسخۂ جون پور) قریب بست سال است کہ طرف مغرب تشریف می دارند...."

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ اوکسفورڈ والا نسخہ بعد کا ہے اور اس میں کسی مدت تک تحریف ہوئی ہے اس نسخے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جہاں تک شعراء کے سلسلے میں بیانات اور انتخاب اشعار کا سوال ہے اس کے بارے میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ دونوں نسخوں میں قابلِ لحاظ اختلاف موجود ہے۔ شورش نے اکثر مقامات پر اپنے ماخذ اور ذرائع معلومات کی صراحت کر دی ہے جس سے اس تذکرے کا زمانۂ تحریر متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اوکسفورڈ والے نسخے سے ایسے بیانات غائب ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

قدر (الف[1]) "قدر تخلص، ساکن شاہ جہاں آباد، اشعار ایشاں مدت است کہ بہ عظیم آباد رسیدہ، زوست....."

---

(۱) الف: نسخۂ اوکسفورڈ۔ ب: نسخۂ جون پور۔

(ب) قدر تخلص، وارستہ از قید مذہب و ملت و پاس وضع از وست ....."

کلیم (الف) "میاں محمد حسین کلیم" ساکن دہلی، صاحب دیوان ریختہ، مرد لیست کامل روزگار۔ می گویند کہ ترجمہ فصوص وده مجلس بزبان اردوئے معلےٰ کردند ....."

(ب) "محمد حسین کلیم، ساکن دہلی، برادر نسبتی تقی میرؔ، صاحب دیوان ریختہ، مرد لیست کامل روزگار ہمزبان حضرت عشق مدظلہ بہ سمع مرا رسیدہ کہ ترجمہ فصوص وده مجلس بزبان ریختہ نمود ....."

کافر (الف) میر علی نقی، کافر تخلص ..... می گویند کہ بجہت شناخت از وست"

(ب) میر علی نقی، کافر تخلص ..... بجہت شناخت ..... در تذکرۂ تقی میر مرقوم است کہ در دہلی مشاعرہ بخانہ ایشان .... آخر از وضع ..... برہم خوردہ۔ و کافر یک تخلص نمود و در محفل و مجلس ہمیں تخلص ظاہر می نمود ....."

مخلص (الف) "رائے آنند رام مخلص تخلص، ساکن دہلی، شاگرد مرزا بیدل و خان آرزوؔ، وکیل نواب عماد الدولہ شاعر فارسی، چنانچہ احوال در تذکرۂ فارسی خان مذکور است۔ از وست ....."

(الف) رائے آنند رام مخلص تخلص، ساکن دہلی، وکیل نواب وزیر اعتماد الدولہ شاعر مقرر بے فارسی، اول از مرزا بیدل اصلاح می گرفت بعدہٗ بخدمت خان آرزو، چنانچہ احوال او در تذکرۂ خان مرحوم مرقوم است۔ از مدت آثار نعت اکرام داشت آخر از دنیا گزشت، از وست ..... زبان خوب نیست، مضمون خوب است"

مضمون (الف) "شیخ شرف الدین مضمون ..... از وست ..... میرے پیغام کو تو اے قاصد کہیو سب سے جدا کر کر۔ میاں محمد حسین کلیم اصلاح نمودہ اند۔ از نوشتۂ تقی میر معلوم شدہ۔ میرا پیغام وصل کو تو اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کر۔

مضموں تو شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب   غصہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

شاعر در مصرع اول نام موزوں کردہ بود۔ اسم اصلاح آرزو ست کہ بجائے وضع بھوت، اسم می خوانند نہ نام، اگرچہ اسم و نام ہر دو یکے ست لیکن زبان زد اسم است"

محسن (الف) "محمد محسن سامریہ، محسن تخلص، شاگرد برادر زادۂ تقی میر از وست ....."

مر گیا پوچھی نہ پر تم نے میری زحمت دل   جی کی جی ہی میں رہی ہائے مری حسرت دل

دریں شعر تاملے است۔ مر گیا می باید۔ مر گیا تھی شاید۔ تقی میر در اصلاح و انتخاب تامل نہ کردہ باشد۔ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ اگر شعر را ..... موقوف نمودہ در تحریر نہ آوردہ شد۔

جب تم .... کھویا۔

ایں رباعی بسیار خوب است ازیں جہت کہ مضمون عموماً ...... است"

میرؔ۔ (الف) "میرشاعر بے نظیر ...... در تذکرہ خود شاعرانِ ہندوستان غلط تلاش نمودہ، مرقوم ساختہ. اگر غلط بدست نیامدہ تاہم اعتراض بے جا د اصلاحِ خود جاری نمودہ. د زندہ و مردہ کسے را سلامت نہ گذاشتہ مگر بعضے اعزہ کہ از و مربوط بودند، آں را محفوظ داشتہ۔ غرض عجب کسے است، و در تذکرہ خود را سید نوشتہ اند، مردماں می گویند کہ شیخ است، چنانچہ کسے گفتہ۔

شیخ تقی نام ہوا اور میر کہا دے

دیگرے می گویند۔

دلی میں ایک شیخ زادہ گنجفہ کا میر ہے" سوائے ازیں فتح علی گردیزی در تذکرہ خود تقی میر را سید نہ نوشتہ است، پس ایشاں را برائے استحکام سیادت کا ذبہ خود میر تخلص نمودہ اند۔ از وست :۔

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

در اول مصرع قطعِ اضافت درست نا شنتہ اند، نزدیک شاعرانِ دہر درست نیست :۔

یہ بھی ایجادِ میر صاحب ہے۔

داگر غلطی نمودہ اند شعر اصلاح طلب است لیکن در تذکرہ خود اول ہمیں شعر نوشتہ اند. غالب است کہ غلطی نباشد بلکہ از رُوئے ایجاد باشد۔

(ب) شاعر بے نظیر محمد تقی میرؔ تخلص ..... در تذکرہ خود ہمعصر خود را در پایۂ الزام کشیدہ و اکثر را ہجو نمودہ مگر بعضے اعزہ کہ از و مربوط دند، آنہا محفوظ داشتہ. غرض عجب کسے است. الحال دیوانِ ایشاں بہ عظیم آباد رسیدہ لیکن بسیار غلط بنظر آمدہ، بنا بریں ازاں انتخاب نہ کردہ کہ شاید غلطی کاتب باشد، البتہ شعر در تذکرہ خود کہ قریب دو صد پنجاہ نوشتہ اند، ازاں مرقوم ساختہ. و خود را سید مومن ...... اند۔ مردماں می گویند کہ شیخ است. چنانچہ مرزا محمد رفیع سودا می فرماید :۔

دلی کا ایک شیخ زادہ گنجفہ کا میر ہے

یعنی در حقیقت میر نیست. شاید ایں حدیث شریف بگوشِ ہوش ایشاں نہ رسیدہ. لعنۃ اللہ علی داخل النسب و علی خارج النسب. وسوائے ازیں سید فتح علی تبریزی در تذکرہ خود میر را سید نہ نوشتہ است. پس ایشاں برائے استحکام سیادت کاذبہ خود میر تخلص نمودہ. وجہ تخلص میر الحال معلوم شد۔ بہر حال ما را ازیں چیز با چہ کار است، دروغ برگردن راوی۔

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکان تیر کا۔

در مصرع اولے اضافت طرف صد پارہ باید یعنی دلِ صد پارہ. ایں د قطعِ اضافت داشتہ اند، و دیگر انیست کہ کاتب نوشتہ است اس نخچیر کا، ایں درست نمی شود. بباید اُس نخچیر کا تا از مصرع ثانی تسلسل باید و معنی پیدا کند والا شعر بے معنی شود ...

نکلے گی میری قبر سے آواز میرے بعد ابھریں گے دل سے عشق ترے راز میرے بعد

(باقی ص۵۶ پر)

محمد شکیل احمد صدیقی

عشقیہ شاعری اور جگر مراد آبادی

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کی شاعری حسن و عشق کے نغمات سے خالی ہو اور دو شاعری تو اس سلسلہ میں بہت کچھ بدنام ہی ہے حالانکہ یہ وہ نغمات شیریں ہیں جو ہر ساز پر گائے گئے۔

خوش قسمتی سے اردو شاعری کی تخلیق اور نشو و نما ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام کے مبارک ہاتھوں ہوئی جو عشق و محبت میں سرشار رہتے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا عشق تھا۔ یہ انہیں خاصانِ خدا کا فیض تھا کہ اردو زبان دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

جس زبان کی نغم ریزی طوطی ہند حضرت امیر خسروؒ کے برگزیدہ ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس کی دلی مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد جیسے صوفیائے کرام نے جو آبیاری کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ان بزرگان عظام کی عاشقانہ لے نے عشق و محبت کے شعلوں کو اتنا بھڑکایا کہ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ اب باپ بھی اگر بیٹے کو کچھ نصیحت کرتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ "اے پسر عشق بورز" کیونکہ "مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلیلیت و حبیبیت برتر است" اسی نصیحت کا ثمرہ ہے کہ ہونہار فرزند عشق و محبت میں ڈوب کر یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبت نہ ہوئے تو پتھر ہے دل

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ
محبت سے ہے تیغ دگردن میں لاگ

محبت سے ہے انتظام جہاں
محبت سے گردش میں ہیں آسماں

محبت سے پروانہ آتش بجاں
محبت سے بلبل ہے گرم فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لئے گل ہے سرگرم ناز

یہ وہ حقیقی عشق ہے جس کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ سارا جہاں اس کے سامنے سرنگوں ہے اسی عشق کی فرمانروائی ہر جگہ جاری و ساری ہے اسی کے لئے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

؎ عشق سلطان است و برہان مبین — ہر دو عالم عشق را زیر نگیں

اس لئے شراب عشق میں مخمور رہنا ہی ان بزرگوں کا شغل زیست تھا وہی فرماتے ہیں۔

؎ خدا کا آسرا، عشق صنم ہے — یہ دو باتیں ہیں جب تک دم میں دم ہے

بیشتر شعرائے متقدمین یا تو خود صوفی اور اہل اللہ تھے یا ان کے دامن فیض سے وابستہ اور ان کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے اسی لئے جس عشق کے نغمات اس عہد کی فضا میں لہرا رہے تھے وہ بیشتر حصہ عشق حقیقی تھا جس میں پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ حقیقت سے دوری اور مجاز سے قربت ہوتی گئی نوائے عاشقانہ پہلے سے کچھ اور تیز ہو گئی۔ لیکن اب عشق حقیقی کے بجائے عشق مجازی اپنے پورے لوازمات کے ساتھ جلوہ گر تھا یہاں تک کہ لکھنؤ پہنچ کر یہ عاشقانہ بوس و کنار انگیا چوٹی اور زلف و گیسو میں ایسی الجھ کر رہ گئی کہ داخلیت کا کوسوں پتہ نہ رہا ہر طرف خارجیت کی فسانہ آرائی نظر آنے لگی معاملہ بندی طور بوالہوسی نے پاک جذبات کی جگہ لے لی اور اسی کو استادی کا کمال ٹھہرایا گیا۔

نیا ورق

زمانہ نے پھر ایک نیا ورق الٹا اور ایسے مصلحین کو جنم دیا جنہوں نے اردو غزل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مروجہ قوانین واصول کو ایک قلم مسترد کر دیا۔ کچھ لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ یہ مصلحین غزل ہی سے متنفر تھے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ ان کی منافرت ان مبتذل وسوقیانہ مضامین اور پست جذبات سے تھی جو غزل کی جان سمجھے جانے لگے تھے۔ اگر صنف غزل سے نفرت ہوتی تو حالی، آزاد اور اکبر کے کلام میں غزل کے اشعار کا وجود ہی نہ ہوتا حالی کو غزل کا سب سے بڑا دشمن کہا جاتا ہے۔ لیکن جب خود ان کی غزلوں کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں واردات حسن و عشق کے ایسے مرقعے ملتے ہیں کہ بے ساختہ زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے ہیں۔

بہر حال آزاد اور حالی کے دور سے دو جماعتیں بن جاتی ہیں ایک وہ جو غزل کی دلدادہ تھی اور دوسری وہ جو مروجہ مبتذل مضامین کی وجہ سے اس کی بیخ کنی پر کمربستہ، لیکن اسے حسن اتفاق کہئے یا خوش بختی غزل کہ اسی افراتفری کے دور میں چار ایسی ہستیاں سرزمین غزل میں رونما ہوتی ہیں۔ جنہوں نے معترضین کے جائز اعتراضات کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کی اصلاح کر کے اس کو پھر محبوب خاص و عام بنا دیا یہ چاروں حسرت، فانی، اصغر اور جگر ہیں۔ جن کی نوائے ساحرانہ اور صدائے عاشقانہ ایک بار پھر ہم کو اسی محفل میں لے چلتی ہے جو متقدمین نے سجائی تھی ان سب میں حسرت کے بعد جگر کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

کو قدرت کی طرف سے عشق خیز دل عطا ہوا تھا اس لئے جب کسی کی پہلی نگاہ غلط انداز بجلی بن کر خرمن دل پر گری تو سارے جسم و جان میں عشق و محبت کے ایسے شعلے بھڑکا گئی جو تمام عمر بجھائے نہ بجھے۔ صبر و سکون کو تاراج کرنے والے وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ لیکن عشق کے کیف و سرور میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی ہو سکتا ہے کہ لوگ عشق حقیقی اور مجازی کی بحث چھیڑ کر یہ کہیں کہ جگر کو معشوق حقیقی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ کیونکہ وہاں معشوق صرف ایک ہی رہتا ہے اور وہ معشوق ازلی ہے برخلاف اس کے جگر کا معشوق اسی دنیا کا باشندہ ہے اور انسانی پیکر میں ہے اس لئے جگر کا عشق عشق مجازی ٹھہرا لیکن یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا ہے کہ عشق مجازی بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حقیقی دوسرا مصنوعی۔

حقیقی عشق مجازی وہ ہے جس میں عاشق کو درحقیقت عشق ہوتا ہے وہ شدائد عشق بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے

اس پر عشق کی ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ فراق میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔ عشق کرنا اس کا شغلِ زیست ہوتا ہے اور کیفیتِ عشق کے سہارے ہی جیتا ہے۔

عشق مجازی کی دوسری قسم یعنی مصنوعی عشق مجازی جسے بوالہوسی کہنا زیادہ موزوں ہے، وہ ہے جس میں عاشق پر عشق کی وجدانی کیفیت کے بجائے ہوا و ہوس کا بھوت سوار ہوتا ہے اور اس کی لامحدود خواہشات میں سے ایک سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو محبوب کے سامنے عشق کا اظہار کر دے اور ان تمام اشعار کو سنا دے اور جملوں کو دہرا دے جو اس نے اس مقصد کے لئے بڑی محنت سے رٹے ہیں لیکن زیادہ تر کوچۂ محبوب کا پہلا ہی امتحان ان عاشق صاحب کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ اس سنگدل محبوب کے عشق کو اسی کے کوچہ میں دفن کر کے کسی دوسرے نرم خو محبوب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے آج اس کا مزاج امتحان پر

ہمارے آجکل کے نوجوان زیادہ تر اسی عشق کا شکار ہوتے ہیں ۔

عشق مجازی کی اول الذکر قسم یعنی حقیقی عشق مجازی کا مقام عشق حقیقی کا اتنا نہیں لیکن پھر بھی کافی اعلیٰ و ارفع ہے بلکہ ایک غیبی عطیہ ہے جس کی سرحدیں عشق حقیقی سے ملی ہوئی ہیں اور یہ ترقی کر کے کبھی کبھی عشق حقیقی بن جاتا ہے۔ اکثر صوفیائے کرام کے واقعات اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ جگر عشق پیشہ ہیں ان کا عشق مجازی ہی ہی لیکن بہت معیاری ہے گرا ہوا نہیں۔ ان کو آبرو نے عشق بہت زیادہ محفوظ ہے۔ اسی لئے وہ عشق کو آسان نہیں سمجھتے ان کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی ہولناک راہ نہیں فرماتے ہیں۔

؎ عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

ایک مشتاق جگر کی طرح اس بحر ناپیدا کنار کی طغیانیوں اور ہولناکیوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اس آگ کے دریا میں قدم رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہاں حقیقی عشق رکھنے والا ہی اس آگ میں کود سکتا ہے۔ جسے ہر چیز میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہر صورت میں اپنے صنم کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔

میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں
دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا۔

صوفی کو فنا فی العشق ہونے کے بعد ہی معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے اس کے نزدیک فنا فی العشق ہونا ہی فنا فی اللہ ہونا ہے۔ اس لئے اسے عشق سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہیں وہ کارخانۂ عالم کی تخلیق کا مقصد عشق قرار دیتا ہے اور کائنات کی ساری چہل پہل اور ہنگامہ خیزی اسے عاشق کی کارگزاری نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کی نوائے عاشقانہ سے پہلے کائنات بزم خموشاں بنی ہوئی تھی۔ علامہ اقبال نے صوفیوں کے اس خیال کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔ ؎

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

زندگی کے ہر ساز میں اسے عشق کے نغمات سنائی دیتے ہیں ساری فضا عشق سے مخمور نظر آتی ہے اس کے نزدیک چمنستانِ حیات میں ہر طرف عشق کی خوشبو بکھری ہوئی ہے ذرّہ ذرّہ میں اسی کی جلوہ گری ہے۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

(اقبالؔ)

جگرؔ بھی اسی پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ انہیں بھی ہر دلفریب چیز عاشق کے افسانۂ شوق کا عنوان نظر آتی ہے۔

ع　موجِ بہار رنگِ شفق لالہ و گل مطلعِ صبح　　چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے

ان کے نزدیک زمین و آسمان چاند ستارے حکایتِ حسن اور فسانۂ عشق کی زندہ مثالیں ہے۔

یہ فلک یہ ماہ و انجم یہ زمین یہ زمانہ　　ترے حسن کی حکایت مرے عشق کا فسانہ

فسانۂ عشق تو وہ لامحدود فسانہ ہے جو ازل سے چھڑا ہوا ہے۔ اور شاید کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ایک سناتے سناتے جو نہی رکتا ہے دوسرا اسے آگے سے شروع کر دیتا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی　　سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

عاشق کے دل میں اگر کوئی تمنا ہوتی ہے تو وہ وصلِ محبوب کی ہوتی ہے۔ امیدِ وصل اس کی شامِ ہجراں میں ٹمٹماتے ہوئے دیئے کا کام کرتی ہے۔ فراق کی تلخ گھڑیاں وہ اسی آسرے پر کاٹتا ہے کہ کبھی گوہرِ مقصود کو پانے کے لئے وہ برسوں کوئے ملامت میں ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ سالہا سال نالہ و فریاد اور گریہ و بکا میں گزار دیتا ہے محبوب کے ایک جلوہ کو وہ ہفت اقلیم کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ رخِ جاناں کی ایک جھلک جان و دل دے کر بھی حاصل ہو جائے تو اسے ارزاں نظر آتی ہے۔ عرفی تو اس حصول کے لئے سو سال تک گریہ و زاری کرنے پر تیار ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

غرضکہ ہجراں نصیب عاشق کے ہجر و فراق کی طویل مدت حالتِ اضطراب میں گذرتی ہے۔ شادمانی اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔ میرؔ نے ایسی ہی ایک شب۔ ہجر کی تصویر کیسے پر حسرت اور درد بھرے انداز میں کھینچی ہے۔

ع　کبھی غش میں رہا شبِ وعدہ　　کبھی گردن اٹھا کے دیکھ لیا

اتفاق سے یہ فراق کی وہ شب ہے جو شبِ وعدہ بھی ہے دوسری راتوں کی کیفیت کا کیا پوچھنا لیکن ہمارے جگرؔ صاحب جن کا ذوقِ محبت بہت بلند پایہ ہے فراق میں بھی ہراساں نہیں وہ ہجوم تیرہ شبی میں بھی خوشی کی ایک کرن تلاش کر لیتے ہیں۔ خوشی کی یہ کرن محبوب کی زلفِ سیاہ کی یاد ہے جس کی سیاہی کے سامنے ہجر کی کالی رات بھی شرماتی ہے۔

ع　چہ خوشی است ذوقِ محبتم چہ بلاست لذتِ غم　　کہ بیادِ زلفِ سیاہ تو بہ ہجوم تیرہ شبی خوشم

عاشق کی اعلیٰ شان ہی مصائبِ عشق پر مسکرانا اور انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبوب کا فراق ان پر شاق نہیں ہے یا اس کی جدائی انہیں بے چین نہیں رکھتی۔ جدائیِ محبوب میں تو ان کا یہ حال ہے۔

ع　ان کے جاتے ہی یہ حسرت چھا گئی　　جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

محبوب کے بغیر انہیں کسی چیز میں کوئی کیف نظر نہیں آتا۔ نہ صبح کی رعنائیاں ہی انہیں محظوظ کرتی ہیں۔ اور نہ شام کی رنگینیاں

چنانچہ محبوب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

تیرے بغیر رونق دیوار و در کہاں　　شام و سحر کا نام ہے شام و سحر کہاں

ان پر وارفتگی عشق کا عالم طاری رہتا ہے وہ عشق میں سراپا ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں نہ ان کو اپنی ہی خبر ہے اور نہ اپنے دل ناشاد کا کچھ حال معلوم ہے۔ جس نے شراب محبت سے بے انتہا مخمور ہو کر دھڑکنا بھی بند کر دیا ہے ؎

پہروں سے دھڑکنے کے بھی آتی نہیں آواز　　کیا جانیے کیا ہے دل ناشاد کا عالم

ان کی یہ وارفتگی اور خود فراموشی شروع سے آخر تک ان کی زندگی کا جزو لاینفک بنی رہی ان کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ ایسے عالم وارفتگی سے منزل ہوش و خرد کی طرف انہیں لانے کی کوشش کی جائے۔ اس لئے چارہ سازوں کا سمجھانا بجھانا ان کی خاطر نازک پر سخت گراں ہے ؎

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے دل اپنا خوشی اپنی　　گریباں اپنا چاک اپنے جنوں اپنا ہنسی اپنی

وہ خوب جانتے ہیں کہ چارہ سازوں کی یہ ہمدردی زبانی اور منہ دیکھی ہے ورنہ زمانہ کا حال تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عاشق کی ہنسی اڑاتا رہتا ہے۔

؎ ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے　　رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

لیکن انہیں اس کی مطلق پرواہ نہیں زمانہ ہنستا ہے ہنسا کرے یہ تو زمانہ کی کوتاہ نظری ہے۔ ورنہ صاحب دل تو راہ محبت میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد ایسے خوش ہوتے ہیں گویا کہ دونوں جہان کی مسرتیں انہوں نے اپنے دامن میں سمیٹ لی ہیں۔

؎ سب کچھ لٹا کے راہ محبت میں اہل دل　　خوش ہیں کہ جیسے دولت کونین پا گئے

ایسے لوگ عشق کا زہر آلود جام بھی اس ذوق و شوق سے پیتے ہیں جس طرح آب حیات

؎ عشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے　　زہر کا گھونٹ بھی ہے آب حیات۔

ایک سچے عاشق کی شان بھی یہی ہے کہ وہ ہر تلخی کو ہنستے ہوئے برداشت کرتا ہے ہر جفا پر مسکراتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیتا ہے لیکن عشق کے رخ زیبا پر توہین کی گرد پڑنے نہیں دیتا۔

جگر بھی اسی قبیل کا عاشق ہے۔ دل کا خون کر دینا گوارہ ہے لیکن آنکھوں کو تر کر کے دامن عشق کو داغدار بنانا گوارا نہیں ؎

توہین عشق دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو　　ہو جائے دل کا خون جگر آنکھ تر نہ ہو

عشق کا یہ وہ مقام ارفع ہے۔ جہاں مجاز و حقیقت کے درمیان ایک نازک سا فرق رہ جاتا ہے۔ ایسے مقام پر پہنچ کر دیوانگی رشک صد ہزار فرزانگی بن جاتی ہے ؎

کیا مقامات ہیں ان سوختہ سامانوں کے　　خضر خود بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے

اس مقام پر پہنچ کر عشق کو حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے اور فنا کے بے درد ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

؎ میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں دنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں۔

شاید یہی وہ مقام ہے جہاں مجاز و حقیقت کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ کیسا مبارک ہے ہمارے شاعر کا جذبۂ عشق جو مجاز کے راستہ پر گامزن ہو کر آہستہ آہستہ ترقی کر کے حقیقت کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔

جگرؔ کی زندگی کا جائزہ لینے پر یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جس عشق کی ابتدا مے و مینا اور مہ رخوں سے ہوئی تھی۔ اس کی انتہا محبتِ رسول اور عشقِ الٰہی پر ہوتی ہے۔ اور یہی جذبۂ عشق آخر میں انہیں کشاں کشاں بیت اللہ اور دیارِ حبیب میں لے گیا کیونکہ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ

عشق لا محدود جب تک رہنما ہوتا نہیں زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

وہاں ان پر عشق کی کیا کیا والہانہ کیفیات طاری ہوئیں؟ یہ کچھ وہی لوگ جانتے ہوں گے جنہوں نے ان کو ان مقامات پر دیکھا ہو گا گنبدِ خضریٰ سامنے ہے پیر پر جانے کا کھولتا ہوا پانی گر کر آبلہ ڈالتا ہے لیکن شاعر کو احساس نہیں ہوتا احساس بھی کیوں؟ سوزِ دل کے سامنے سارے سوز بیکار ہیں۔ آبلۂ عشق کے مقابلے میں کسی آبلہ کی کوئی حقیقت نہیں محبت کی ٹیس سارے دردوں پر غالب آجاتی ہے۔ اب وہ ایک ایسے حسن کے جلوے میں ہیں۔ جسے ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔

؎ جز عشقِ معتبر یہ کسی کو خبر نہیں ایسا بھی حسن ہے جو بقیدِ نظر نہیں

دیدۂ دل پر سوز سے ہی اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کو اب کبھی کبھی اس عالمِ خاص کا نظارہ نصیب ہوتا ہے۔ جو اپنی رفعتوں اور لطافتوں میں حسن و عشق سے بلند اور لطیف ہے۔

؎ دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے بھی کبھی کبھی جگرؔ حسن سے بھی بلند تر عشق سے بھی لطیف تر

کون کہہ سکتا ہے کہ عشقِ مجازی میں بھی کوئی ایسا بلند و لطیف "جہانِ خاص" ہوتا ہے۔ یہی نہیں لیجئے عشق کی آخری ارتقائی منزل بھی طے ہو گئی اور عشق مقامِ تقرب کی اس آخری سرحد تک پہنچ گیا۔ جہاں دیدۂ دل سے بھی واسطہ نہیں پڑتا ہے

اس مقامِ قرب تک اب عشق پہنچا ہے جہاں دیدۂ دل کا بھی اکثر واسطہ ہوتا نہیں

یہی تو وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہونٹ سل جاتے ہیں اور دہن پر مہرِ خاموشی ثبت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ رازِ دل تک محبوب سے نہیں بتا سکتے اور بتانے کی ضرورت بھی کیا۔ محبوب خود شناسائے راز ہے اس راز کے کہنے اور سننے کیلئے زبان و گوش کی منت پذیری کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سازِ خاموش کی صدا محبوب کے علاوہ کوئی سمجھ سکتا ہے

؎ جسے میں بھی خود نہ بتا سکا مرا رازِ دل ہے وہ رازِ دل جسے غیر دوست سمجھ سکے مرے ساز میں وہ صدا نہیں

یہ ہے جگرؔ کی عشقیہ شاعری کا ایک دھندلا سا خاکہ جسے اجاگر اور رواں کرنے کے لئے کسی کی سیاہی قلم کی ضرورت نہیں۔ شاعر کا خونِ جگر خود اس کے کلام کے روپ میں ڈھل کر ان نقوش کو رنگین بنا رہا ہے بلکہ اس رنگ آمیزی میں اس کے محبوب ہی کی کارفرمائی ہے۔ جیسا کہ بقول شاعر اس کی آواز خود اس کی آواز نہیں در پردہ اس کے محبوب ہی کی آواز ہے۔

؎ مرے درد میں یہ خلش کہاں مرے سوز میں یہ تپش کہاں کسی اور ہی کی پکار ہے مری زندگی کی صدا نہیں

راجیندر ناتھ شیدا

محروم کی نظمیں

پروفیسر تلوک چند محروم۔ جن کے انتقال کو تقریباً ایک سال ہوا، اردو کے ان ممتاز شاعروں میں تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ادب کی خدمت میں صرف کیا۔ موجودہ صدی کے قریب قریب آغاز ہی کے ساتھ ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب سے لے کر وفات سے کچھ ہی پہلے تک وہ برابر شعری ادب میں اضافہ کرتے رہے۔ کم و بیش ساٹھ سال کے اس طویل عرصے میں اردو شاعری کا کارواں کئی منزلوں سے گزرا۔ راہ میں متعدد نشیب و فراز آئے۔ نئی نئی تحریکیں ابھریں اور دب گئیں۔ شاعری ماحول کے اثرات کو اپنے دامن میں سمیٹتی بھرتی۔ جدید و قدیم کی آویزشوں میں الجھتی اور آمیزشوں سے تقویت حاصل کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ محروم کی نظریں بھی زندگی اور ادب کی بدلتی قدروں پر پڑیں اور ان کے ذہن نے حسب استعداد و وقت کے تقاضوں کو قبول کیا۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ اس صدی کے ابتدائی دور میں ہماری قومی زندگی پر مغربی حکومت اور تہذیب و تمدن کے گہرے اثرات پڑ رہے تھے جس سے فکر و عمل کے نئے سوتے پھوٹتے جاتے تھے۔ زندگی کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالئے۔ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ معاشی و معاشرتی ہو یا تعلیمی اور علمی۔ خود ادب ہی کو دیکھ لیجئے۔ ہر طرف اصلاح کا ذوق و شوق کارفرما نظر آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کسی "آفتاب تازہ" کی تپش سے قدامت کا برفستان پگھل کر ہمہ گیر اصلاح کا دریا بن گیا ہے۔ جو مختلف راستوں سے بہتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ راہ میں رکاوٹیں بھی ہیں۔ جن سے ٹکرا کر اس کے دھارے اپنے بہاؤ کے رخ اور لہجے بدلتے بھی رہتے ہیں لیکن پھر وہ سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اپنی مخصوص سمت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ وقت کا بہاؤ۔ قومی زندگی میں فکر و عمل کی یہ حرکت تھی یا یوں کہئے، جدید و قدیم کی یہ کشمکش تھی جس میں محروم کی نوجوانی نے آنکھیں کھولیں۔ اور جس کے اثرات کو ان کے ذہن نے اپنے اندر جذب کیا اس لئے ان کی نظموں میں قدم قدم پر ہمیں ان اثرات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

فرانسیسی مفکر اور نقاد ایٹن (TAINE) کا خیال ہے کہ ادب ہر صورت میں ہمعصر قومی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے، لیکن ادب کی تخلیق میں ادیب کی شخصیت اور تاریخی روایات کو بھی بڑا دخل ہوتا

ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے کسی ادیب کی تخلیقات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن نہیں۔ شاعر کے شعور کو جاننے کے لئے اس کی ہمعصر تحریکات اور رجحانات کا جاننا تو ضروری ہے ہی۔ ساتھ ہی اس کے ذاتی ماحول، تعلیم و تربیت اور افتادِ طبع کا علم اور قومی اور ادبی روایات سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا ذہن عموماً تیس سے چالیس سال کی عمر تک بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی زمانے کی ذہنی کیفیت اس کی شخصیت کی بنیاد بنتی ہے۔ آئندہ زندگی کے واقعات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو اس کا نقطہ نظر وہی ہوتا ہے جو تیس سے چالیس سال کی عمر میں پختہ ہو کر ذہن میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں کسی شاعر سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ وہ بعد کے حقائق کی روشنی میں اپنے محسوسات میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرے گا۔

پروفیسر محروم کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی کے کچھ واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن مغربی پنجاب میں ضلع میانوالی کا ایک قصبہ عیسیٰ خیل تھا۔ جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ محروم نے ایک نظم "محروم کا وطن" میں اپنے وطن کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصبہ جس علاقے میں واقع ہے وہ اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ لوگوں کو ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ قصبے میں میٹھا پانی تک نایاب ہے جس کی وجہ سے عورتیں میلوں سے پانی کے مٹکے اپنے سروں پر رکھ کر لاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں اور درندوں کا بھی خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں مبالغہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ممکن ہے اب حالات کچھ بدل گئے ہوں لیکن محروم کے ذہن کی جس ماحول میں تربیت ہوئی وہ یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے علاقہ کے لوگ عموماً سیدھے سادہ اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان کے دل چھل کپٹ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان میں خلوص۔ قناعت۔ راست روی اور جرأت مندی ہوتی ہے محروم کی تعلیم اور پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی اور شعری تخلیق کی صلاحیت تھی۔ چنانچہ ارد گرد کے حالات نے انہیں ایک سادہ مزاج، قانع، مخلص اور ایثار دوست انسان بننے میں مدد دی۔ ایک تو یہ ماحول یوں بھی مذہبی اور اخلاقی تھا۔ اس پر انہوں نے فارسی ادب پڑھا۔ اور تعلیم کا پیشہ اختیار کیا۔ جس سے ان کے ذہن پر مذہبی اور روحانی قدریں مسلط و مستحکم ہو گئیں۔

اب رہے ملک اور قوم کے عام حالات، ان کا بیان تفصیل چاہتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر یہ حالات پروفیسر محروم کے ذہن پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لئے مختصراً یوں سمجھئے کہ اس صدی کے شروع میں جب وہ عمر کی اس منزل سے گزر رہے تھے۔ جب ذہن سماجی ماحول کے اثرات قبول کرنا شروع کر دیتا ہے ہندوستان مضبوطی کے ساتھ حکومت برطانیہ کے چنگل میں تھا۔ یوں تو ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی سیاسی اقتدار انگریز کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا اور شاہ دہلی کی حیثیت شاہ شطرنج کی سی تھی لیکن بغاوت کے فرو ہونے کے بعد تو رہا سہا قصہ

بھی پاک ہوگیا۔ بغاوت میں سب سے اہم رول جن طبقوں نے ادا کیا تھا وہ تھے۔ والیانِ ریاست۔ جاگیر دار اور مذہبی علماء۔ اس آخری شکست سے ان کے بھی حوصلے پست ہوگئے۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ والیان ریاست اور جاگیر داروں نے حکومتِ وقت کی اطاعت میں مصلحت دیکھی اور مذہبی طبقے کے وقار میں کمی ہونا شروع ہوگئی۔ غرض یہ طبقہ حکومت کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے

اسی زمانے میں کچھ نئے طبقے اور نئی تحریکیں ابھریں۔ مذہبی اصلاح کی کچھ تحریکیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء سے پہلے سے موجود تھیں۔ اب اس رجحان کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ غرض دونوں مذاہب میں اصلاح کی نئی نئی تحریکیں نمودار ہونے لگیں۔ یہ تحریکیں داخلی اور خارجی محرکات کے عمل اور ردعمل سے ظہور میں آئی تھیں۔ نہ تو یہ کلیتاً مغربی اثرات کا نتیجہ تھیں نہ خالص قومی ضروریات کا۔ یہ بدیہی طور پر مغرب کی ہمعصر فکری سطحوں کو نہیں چھو سکتی تھیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ جدید اور قدیم کے درمیان ایک سمجھوتہ قرار دیا جا سکتا ہے لہٰذا جہاں انہوں نے اپنے مذاہب کی مفروضہ قدیم صورتوں کی صداقت اور افادیت پر زور دیا ہے اور شد و مد کے ساتھ انکی حمایت کی وہیں کچھ ایسے عقائد کی جو بظاہر غیر معقول اور مضر تھے۔ مخالفت بھی کی۔ کہنا یہ کہ ان باتوں کا نفسِ مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اتفاقی چیزیں ہیں۔ یہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہب میں شامل ہوتی گئی تھیں انہیں محض توہمات کہہ کر مذہب سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد مذہبی حالات کی طرح سیاسی منظر بھی بدلا۔ جاگیرداری کی شکست پر سیاسی قیادت نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ہاتھ میں آگئی جس نے مغرب کی لبرل ازم، وطنیت اور قومیت کی تحریکوں سے روشنی حاصل کر کے آئینی اصلاح کے مطالبات پیش کئے۔ نوآبادیاتی نظام میں حاکم و محکوم کا امتیاز، عام افلاس، صنعتی، تجارتی اور تمدنی پس ماندگی، ان اور ایسی ہی اور باتوں نے سیاسی جد وجہد کو ہوا دی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس دور میں برطانوی حکومت خود ایک عجیب و غریب تہذیبی تضاد کا شکار تھی۔ جہاں برطانیہ کے مفکر سیاسی۔ اقتصادی۔ مذہبی، سماجی غرض زندگی کے ہر شعبے میں لبرل ازم کا جھنڈا بلند کر رہے تھے۔ نوآبادیات میں اپنی رجحانات کے خلاف ان کی قومی حکومتوں کو نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ جو انکی اخلاقی قوت کے لئے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اور ہندوستان میں ان رجحانات کے حاملوں کے لئے روحانی تقویت کا سرچشمہ اس کے علاوہ یورپ میں ماضی کی کھوج کا شوق ہندوستان میں کلاسیکی ادبوں کے مطالعے اور ماضی کے دھندلکوں کو روشن کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ مغرب میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے دعووں کے ردِ عمل میں یہاں بھی اپنے ماضی پر فخر و مباہات کے جذبات ابھرے اور قومی شعور کا حصہ بن گئے۔ انہوں نے سیاسیات کو بھی متاثر کیا۔ سیاسی جد و جہد کو تقویت پہنچائی مگر اس کے رخ کو مختلف سمتوں میں موڑ دیا ہے۔ جس سے بعد کو

پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔ بہرکیف اس سے قومی شعور میں مذہبی اور روحانی عناصر اور بھی بڑھ گئے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس دور میں اکثر اصلاحی تحریکوں نے، وہ کسی طرح کی کیوں نہ ہوں۔ یا تو متوازی تعلیمی تحریکیں چلائیں یا اپنے فروغ کے لئے تعلیم کو استعمال کرنے کی کوشش کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں اپنے مقاصد کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے کیونکہ آخر انہی پر آئندہ ان تحریکوں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار تھا۔ اب رہا ادب، تو جن مقاصد کے لئے تعلیم استعمال میں آسکتی تھی۔ ان کے لئے ادب بھی ایک موثر ذریعہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہم اس دور کے ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں اصلاح اور کردار سازی کی یہی روح ہر طرف سرایت کئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ادب کی کوئی صنف نہیں جو ان سے متاثر نہ ہو۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔

اردو شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نظمیں تو اردو میں ایک مدت سے لکھی جا رہی ہیں لیکن نظم نگاری کے جدید دور کا آغاز "انجمن پنجاب" کے قیام کے ساتھ ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد ہی شاعری میں اصلاح تھا۔ بقول حالی شاعری کو عشق و مبالغے سے نجات دلا کر اسے وسعت دینا اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھنا تھا۔ آزاد۔ حالی اور ان کے معاصرین جو جدید اردو نظم کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ مغربی شاعری سے ناواقفیت کی وجہ سے اپنی شاعری کو مغربی سانچوں میں تو نہیں ڈھال سکتے تھے لیکن وہ اردو شاعری کو کچھ بدعتوں سے پاک کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اس کا اثر غزل پر بھی پڑا لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نظم کو خاص طور پر موزوں سمجھا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحریک کا باہری ڈھانچہ خارجی اثرات اور کرنل ہالرائڈ کی مساعی کا مرہون منت ہے لیکن اس کا خمیر داخلی ہے کیونکہ شاعری کی اصلاح جس صورت سے عمل میں آئی وہ خود اردو شاعروں کے ذہنوں کی پیداوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور کی اردو شاعری اپنی روایات سے بالکل منہ موڑ کر نہیں چلتی بلکہ انہی روایات میں سے نکلتی ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں اجنبیت اور غرابت بہت کم ہے۔

جدید اردو شاعری کے علمبرداروں کے پیش نظر دو باتیں تھیں ایک منفی اور ایک مثبت۔ وہ روایتی شاعری کی کچھ باتوں کو معیوب سمجھ کر انہیں ترک کرنے کے حامی تھے اور کچھ باتوں کو شعوری طور پر رائج کرنے کے۔ روایتی شاعری کی جن باتوں کو ترک کرنا چاہتے تھے ان میں اصلیت سے بعید باتیں اور لایعنی تخیل شامل ہیں۔ مبالغہ اور استغراق بھی اسی ضمن میں آتے ہیں اور ایسے صنائع بدائع کا استعمال بھی جو شعر کے معنی میں اضافہ یا حسن پیدا نہ کرتا ہو۔ اب رہا جدید شاعری کا مثبت پہلو تو اس میں شاعری میں واقعیت کا خیال رکھنا یا اسے حقیقت سے قریب لانا۔ سیدھے سادہ مگر پر اثر طریقے سے بات کہنا۔ شاعری کو اخلاقی اور روحانی تعلیمات اور قومی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا۔ اور

ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر مناظر قدرت کی تصویریں پیش کرنا شامل ہے۔ یوں یہ تنقیدی اور افادی نقطۂ نظر تھا جس نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی یا دوسرے لفظوں میں جس کی روشنی میں مروجہ شاعری کی اصلاح عمل میں آئی۔ اس سلسلے میں کیا کچھ ہوا؟ کس حد تک ہوا؟ ایسا ہونا کہاں تک درست تھا؟ یہ سب تفصیلات کی باتیں ہیں۔ جنہیں سردست نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

رہی بات ہیئت شعر اور اصناف سخن کی تو جس طرح اس دور میں دوسری کچھ چیزیں ابھریں کچھ دبیں۔ کچھ کی اہمیت گھٹی کچھ کی بڑھی۔ اسی طرح جاگیرداری اور روائتی مذہب کے انحطاط کے سبب سے قصیدے اور سانحات کربلا سے متعلق مرثیے کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ جدید موضوعات پر مختصر نظمیں ان کی جگہ لینے لگیں جو زیادہ تر مثنوی مسدس۔ قطعہ وغیرہ کی فارم میں لکھی جاتی تھیں۔ پہلے غزل مقبول ترین صنف سخن تھی۔ اب نظم غزل سے زیادہ اہم ہو گئی کیونکہ نظم نئے نئے دور کی پیغامبری کی اور ایسا کرنے کی وہ غزل کی نسبت زیادہ صلاحیت بھی رکھتی تھی چونکہ یہ جدید شاعر اپنے فن کو قوم کے اخلاقی اور سماجی سدھار کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ دلائل دے کر یا قصے کہانی بیان کر کے کچھ باتیں سمجھانا اور ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ اسلئے ان کے اسلوب بیان میں جذباتیت اور اثر آفرینی کو اور تکنیک میں بیانیہ، خطیبانہ اور مکالمانہ عناصر کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ویسے نئی اصناف کے اخذ و اختراع کو ان شاعروں نے بہت ضروری نہیں سمجھا۔ مروجہ اصناف میں کچھ معمولی سے تغیر و تبدل پر اکتفا کی۔

اب محروم کی شاعری کو ان حقائق اور واقعات کے پس منظر میں رکھ کر دیکھئے تو ان کے تمام خد و خال نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے۔ مذہب، روحانیت اور اخلاقیات میں ان کی دلچسپی۔ ان کے دل میں قوم و وطن کا درد۔ انکی وسعت نظر۔ خانگی زندگی کے حادثات سے پیدا ہونے والا سوز و گداز۔ مظاہر قدرت پر ان کے مخصوص تاثرات۔ اور اہل قوم کو خصوصاً نوجوانوں کو ایثار و عمل کی تلقین کا ذوق۔ بچوں میں دلچسپی۔ غرض ان کے فکر و شعور کا کوئی گوشہ روشنی میں آئے بغیر نہیں رہے گا۔ ساتھ ہی ان کے فکری محرکات کا باہمی ربط اور شاعری میں گوناں گوں صورتوں سے ان کا اظہار ایک حقیقت بن کر نظر کے سامنے آ سکے گا۔

پروفیسر محروم مذہب اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس زمانے میں ہر شخص کے دماغ پر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور مذہب کی گہری چھاپ تھی۔ روحانیت میں ہر شخص کا اعتقاد تھا۔ کچھ تصورات تو سینکڑوں برس سے ذہنوں میں جاگزیں تھے۔ غیر مشتبہ حقیقت اور اعتقاد کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہر آدمی کو دنیوی زندگی کے مسائل کے ساتھ آخرت کی فکر بھی رہتی تھی اور آخرت کی کھیتی دنیا تھی جسے مروجہ مذہبی تعلیمات کے ذریعہ بویا جا سکتا تھا۔ مذہب اور روح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ روحانیت کے مروجہ تصورات بھی عقیدوں کی صورت اختیار کئے ہوئے تھے۔ اسی طرح روح کی طہارت اور نیکی فکر و عمل لازم و ملزوم ہیں۔ مذہب کی رو سے یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو

پہلو ہیں - محروم کا ذہن اس صدی کی دوسری دہائی تک بالغ ہو چکا تھا. اس نسل کے تقریباً تمام ہندوستانی مفکران چیزوں میں اعتقاد رکھتے تھے اور انہیں مسلّم حقیقتیں تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب سے البتہ کبھی کبھی ان حقیقتوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھا جانے لگا لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں محروم اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ذہن ایسے معاملات میں نئے اثرات قبول کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے. اس لئے ان کے شعور میں ان اثرات کو تلاش کرنا بے سود ہوگا۔

محروم ایک عام ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کے عقائد بھی ایک عام ہندو کے سے ہیں. لیکن ایک بات قابل توجہ ہے ان کا مشرب بہت وسیع ہے. ان کے دل میں ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام ہے اور وہ ہر مذہب کے محاسن کو پیش نظر رکھنے اور مطاعن کو نظر انداز کرنے کے قائل تھے۔ مذاہب کو پرکھنے کا یہ طریقہ خالص علمی نہ ہو کر بھی طہارت نفس کا مظہر ضرور ہے۔ دراصل اس کی تہہ میں عقائد کی نزاعی باتوں کو پس پشت ڈال کر مشترکہ زمین تلاش کرنے کا جذبہ ہے۔ یہی جذبہ ہے جس کا اظہار رومی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی۔

اس کے علاوہ یہ نظریہ مختلف مذاہب میں اعلیٰ قدروں کی یک رنگی پر زور دیتا..... اور ہمہ گیر انسانی محبت کا درس دیتا ہے. ہندوستان کے کچھ سنتوں اور صوفیوں کے عقائد سے مطابقت رکھتا ہے جس کا گاندھی جی کے ذہن پر بھی بڑا گہرا اثر تھا اور ظاہر ہے کہ محروم گاندھی جی کی تعلیمات سے بھی متاثر تھے۔ پروفیسر محروم کی نظموں کے مجموعے۔ "نیرنگ معانی" میں "چراغ راہ" کے عنوان سے ایک الگ باب ہے جس میں بانیان مذاہب اور ہادیان دین سے متعلق نظمیں شامل ہیں. اس میں پیغمبر اسلام. حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ. حضرت عیسیٰ. گورو نانک، گرو گوبند سنگھ، رام، کرشن. سوامی رام تیرتھ اور مہاتما ہنسراج کی سیرت اور تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے. عام طور پر ان کی زندگیوں سے متعلق روایات سے واقعات انتخاب کر کے انہیں نظم کیا گیا ہے۔

یہ خیال کہ کسی کا مذہب کچھ بھی کیوں نہ ہو ہر انسان دوسرے انسان کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ محروم کی ایک نظم سیرت نبوی کی ایک مثال" میں بڑے ڈرامائی اور موثر پیرائے میں ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے. حضرت محمدؐ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں. سامنے سے کسی یہودی کا جنازہ آتا ہے. اس پر آنحضرت تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں. صحابہ حیران ہیں سمجھ نہیں سکتے کہ مشرک مردے کی تعظیم کیوں کی گئی؟ پوچھتے ہیں. اس پر جواب ملتا ہے۔

یہ فرمایا مجھے معلوم ہے وہ نامسلماں تھا میسر ہو سکی اس کو نہ توفیق خدا جوئی۔
مگر اس بات سے انکار ہرگز ہو نہیں سکتا اسی جان آفرین پاک کی تخلیق تھا وہ بھی

اسی طرح کی ایک نظم اور ہے "مرہم شفا" گورو گوبند سنگھ آنند پور میں دشمن سے نبرد آزما ہیں. گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے. میدان جنگ میں ایک شخص ہے "بھائی کنہیا"۔ یہ دوست دشمن میں تمیز کئے بغیر ہر زخمی کو پانی پلا رہا ہے کسی

کو اس کا دشمنوں کو پانی پلانا ناگوار گزرتا ہے۔ آخر اسے گورو گوبند سنگھ کے روبرو پیش کیا جاتا ہے۔ گورو جی اس سے جواب طلب کرتے ہیں تو وہ عرض کرتا ہے "گر ہے خطا تو دیدۂ یک بیں کی ہے خطا" اور یہ بھی کہتا ہے "کی ہے حضور ہی نے مجھے یہ نظر عطا" یہ سن کر گورو گوبند سنگھ اس کی نیک عملی کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس سے خوش ہو کر اس کے پانی کو "مرہم شفا" کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔

ایسی نظموں میں محروم کا عالم گیر انسان دوستی کا پاکیزہ جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ زندگی کی گتھیاں محض نیک جذبات کے ناخنوں سے نہیں سلجھتیں۔ مسائل حیات بڑے پیچ در پیچ ہیں انہیں حل کرنے کے لئے بڑی بصیرت اور انتھک عمل صالح کی ضرورت پڑتی ہے۔ محروم کا مزاج "بے ہمہ شو با ہمہ شو" کا سا تھا۔ ان کی روح کو دنیا کے تعلقات اور معاملات میں دلچسپی تھی بھی اور نہیں سا بھی۔ وہ دنیا میں سکون اور محبت تلاش کرتے تھے اس کے لئے جہد و عمل کے قائل تھے لیکن جب وہ اہل دنیا کو خود غرضانہ بھاگ دوڑ میں مصروف دیکھتے تھے، لوگوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجشیں اور آویزشیں فریب و ریاکاری اور ظلم و نا انصافی دیکھتے تھے تو ان میں اکتاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور وہ ان ہنگاموں سے دور بھاگ کر کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہنے کی تمنا کرنے لگتے تھے اور کہتے تھے۔

دنیا میں بہت دوڑے　　راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت　　تجھ میں ہی نظر آئی

اے گوشۂ تنہائی

یہ جذبہ کبھی کبھی اتنا شدید ہوتا تھا کہ وہ انسان کو سخت وحشت کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے لیکن یہ سب تصویر کا محض ایک رُخ ہے اس تصویر کا دوسرا رُخ ہے انسان کو بہتر بنتے دیکھنے کی تمنا اس کی زندگی میں راحت و مسرت بڑھتے دیکھنے کی تمنا۔ زندگی سے غلامی، افلاس، نا انصافی، عداوت اور ظلم کو مٹتے دیکھنے کی تمنا اور انسانوں کو ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے بے خوفی سے جد و جہد کرتے اور ہر ممکن قربانی دیتے دیکھنے کی تمنا۔ محروم کا شعور جس دور میں بن کر اپنی مخصوص صورت اختیار کر رہا ہے۔ اس میں یہ تمنائیں روحانیت اور سیاسیات کے ڈانڈے ملا رہی تھیں۔ قوم آزادی کی جد و جہد میں مصروف تھی۔ خیال تھا کہ سیاسی غلامی تمام خرابیوں کی جڑ ہے جس کو اکھاڑ پھینکنا ہر ہندوستانی کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے۔ اس لئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر محروم کو اپنے ان گنت ہموطنوں کی طرح قومی سیاسیات کی شورش اور ہنگامہ خیزی میں بھی دلچسپی ہے تو یہ کوئی تعجب والی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا۔

پروفیسر محروم نے آزادی کے لئے ہمعصر جد و جہد کو جس نظر سے دیکھا اس کی جھلکیاں اُن نظموں میں نظر آئیں گی جو ان کے مجموعے "کاروانِ وطن" میں شامل ہیں۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۶ء تک کی ان نظموں میں قومی سیاسیات کے آثار

چڑھاؤ پر شاعر کے تاثرات ان میں موجود ہیں۔ صدیٔ حاضر کی دوسری دہائی کے آخری سالوں میں اشتراکیت کی جو آواز ملک کی فضا میں گونجنے لگی تھی وہ البتہ ان نظموں میں سنائی نہیں دیتی اور نہ ہی ان میں اس وقت کے نوجوانوں کی وہ تڑپ نظر آتی ہے جو رجعتی مذہب اور اخلاق کی حدوں کو عبور کر کے اپنے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ اس وقت تک محروم کے محسوسات پک چکے تھے۔

اب ان نظموں کو لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے کی نظموں میں ہم زیادہ تر وطن سے جذباتی رگاؤ۔ دور حاضر میں قوم کی زبوں حالی اور ماضی کی عظمت کا احساس نیز مستقبل میں ترقی کے لئے تحریک اور ایسے ہی جذبات قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی نظم حالی کی "مدوجزر اسلام" اور کیفی کی "بھارت درپن" کی طرح طویل تو نہیں ہے اور نہ ان میں قومی عروج و زوال کی ان کی ایسی تفصیلات ہیں لیکن جذبات عموماً وہی ہیں۔ اس کے بعد شاعر کی نظر میں اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دل میں قومی رہنماؤں کی ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے قربانیوں کی قدر اور ان کے لئے احترام کے جذبات امڈتے ہیں۔ وہ ظفر، گوکھلے، تلک، گاندھی اور اجمل خان وغیرہ کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور گوناں گوں ہمعصر واقعات پر ایک وطن پرست کی حیثیت سے اظہار خیال کرتا ہے۔ سودیشی کی تحریک افریقہ میں گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستانیوں کی جدوجہد سے لے کر محروم نے گاندھی جی کے قتل اور بھودان کی تحریک تک نہ جانے کتنے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

افریقہ میں ہندوستانیوں کی جدوجہد پر چکبست کی نظم "فریاد قوم" بہت مشہور رہے۔ ایسے ہی کچھ جذبات کی حامل محروم کی "نظم جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی" ہے۔ ان دونوں نظموں میں افریقہ میں ہندوستانیوں کی پریشان حالی پر اظہار غم۔ گاندھی جی کے ایثار اور قیادت کو خراج تحسین، اور وہاں کے مقامی حکام کے ظلم و ستم کے خلاف حکومت برطانیہ سے فریاد موجود ہے۔ اس معروضے کی وجہ ہے کہ یہ سب کچھ انہی حکام کی شرارت اور فرعونیت کا نتیجہ ہے جسے برطانوی حکومت کی رعایا پروری اور انصاف پسندی برداشت نہیں کر سکتی۔

محروم کہتے ہیں۔

گورنمنٹ سے فریاد اب ہماری ہے — کہ اے وطن کے ممدائے نگاہدار وطن
یہ خواہ مخواہ کی ہم سے کدورتیں کیسی — اڑائے دیتے ہیں اغیار کیوں غبار وطن۔

محروم نے لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی اور ان کی اور مولانا محمد علی جوہر۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی رہائی۔ جلیان والا باغ کا خونی واقعہ، تحریک خلافت۔ فرقہ وارانہ فسادات، سائمن کمیشن، بھگت سنگھ کو پھانسی لگنا۔ گاندھی جی کی بھوک ہڑتال۔ گول میز کانفرنس۔ کمیونل اوارڈ۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کی تباہ کاریاں۔ قحط بنگال۔ آزاد ہند فوج۔ تقسیم ہند اور اس سلسلے میں خونیں ہنگامے، جفاکاری اور سفاکی۔ گاندھی جی کی شہادت اور جشن آزادی ایسے موضوعات پر بھی متعدد

نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ چکبست کی طرح انہوں نے بھی سیاسی رہنماؤں کی وفات پر مرثیے لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ ایسے رہنماؤں میں گوپال کرشن گوکھلے۔ بال گنگا دھر تلک، سی آر داس لالہ لاجپت رائے۔ بشندر ناتھ داس موتی لال نہرو۔ بھگت سنگھ۔ گاندھی جی۔ تیج بہادر سپرو۔ سروجنی نائیڈو رفیع احمد قدوائی اور ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ محروم کو لالہ لاجپت رائے سے خصوصی لگاؤ معلوم ہوتا ہے لیکن ناموں کی اس فہرست ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی عقیدت مذہبی یا علاقائی حدود کی پابند نہیں تھی۔ وہ وطنیت اور قومیت کے لئے ایثار کرنے والوں کے پرستار تھے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

محروم چاہتے تھے کہ پوری ہندوستانی قوم مذہبی۔ تہذیبی اور لسانی اختلافات کو نظر انداز کر کے حصول آزادی کی تحریک میں شریک ہو اور باہمی محبت اور اخلاص کو اپنا شعار بنائے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی آرزو اور توقع کے خلاف ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے تھے۔ یہ ہماری قومی زندگی کا بڑا افسوسناک پہلو رہا ہے۔ اس معاملے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قومی قیادت وقت نظر اور بصیرت سے زیادہ جذبات سے کام لینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے اور معاملات برابر الجھتے گئے۔ بہرکیف جس بات کی توقع بڑے بڑے قومی رہنماؤں سے نہیں کی جاسکتی محروم سے کرنا تو نادانی ہوگا لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان فسادات سے بہت دل برداشتہ تھے، فساد کرنے والوں کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، قوم کے دشمنوں میں شمار کرتے تھے۔ ان کی متعدد نظموں میں ایسے واقعات پر انتہائی رنج و غم اور کبھی کبھی ان سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۴ء میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ اس وقت کی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

قید سے یوں گے رہا جب سرفروشانِ وطن
یوں کہیں گے دیکھ کر حالِ پریشانِ وطن

حیف ہم جن کیلئے محروم آزادی ہوئے
اپنے ہاتھوں سے وہ جاہل وقفِ بربادی ہوئے

محفلِ حبِّ وطن میں کل جو تھے شیر و شکر
آج ہیں اک دوسرے کے تشنۂ خوں سر بسر

محروم کو پہلے اس بات پر فخر تھا کہ کم از کم پنجاب کی فضا اس فتنے سے محفوظ ہے لیکن مارچ ۱۹۴۷ء میں جب وہاں بھی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو انہیں کہنا پڑا۔ لہجہ کی درشتی ملاحظہ فرمائیے۔

آدمیت کے لباسِ برتری کو پھاڑ کر
شوق عریانی میں یہ رقص جنوں اے فتنہ گر

تو نے اپنی بربریت کے دکھائے وہ ہنر
خاک میں جن سے ملی توقیر انساں سر بسر

آسمانوں سے صدا آئے گی یہ شام و سحر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

آج تک دیکھی سنی ہے کس نے ایسی سرزمیں
بے گناہوں، امن خواہوں کو اماں جس میں نہیں

چیر ڈالیں شیر خواروں کے جگر ارباب کیں۔
بھون ڈالے جائیں یوں اپنے مکانوں میں مکیں

اس شقاوت کو شجاعت نام دیں از راہ شر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

زندگی کی حرکت اپنے اصولوں کی پابند ہے۔ زندگی ہماری نیک خواہشات کے اشاروں پر نہیں چلتی۔ اوپر کے بند ہی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، چونکہ محروم اور ان کے خاندان کو بھی ۱۹۴۷ء میں دہلی آ کر بسنا پڑا تھا۔ جہاں کی فضا شروع شروع میں انہیں نامانوس محسوس ہوتی تھی اس لئے یہ قیامت صغریٰ کے بیان میں ان کے ذاتی اضطراب کا خلوص بھی شامل ہے۔ تقسیم کے وقت اور اس کے بعد محروم اور ان کے عزیزوں پر جو بیتی۔ فسادات نے ان کے ذہن کو جس طرح جھنجھوڑا۔ وہ شکست خواب کی ایک اور قابل توجہ مثال ہے۔ یہ آپ بیتی ہے لیکن یہ جگ بیتی بھی ہے کیونکہ جو کچھ انکے ساتھ ہوا۔ وہ دونوں ملکوں کے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ اس سے متعلق ان کے جذبات کا اندازہ لگانے کے لئے ان کی نظم "پاکستان کو الوداع" کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

اے مرے پیارے وطن میرے بزرگوں کے وطن
اے مری راحت کی دنیا اے مرے اچھے وطن

عمر بھر تیری وفاداری کا دم بھرتا رہا
مدح تیری شعر میں زیب رقم کرتا رہا

مشغلہ میرا رہا علم و ادب، شعر و سخن
اور سمجھا میں اسی کو خدمت اہل وطن

حرص دنیا سے رہا یکسو دل دانش پذیر
ننگ تن میرے لئے تھا ذوقِ دیبا و حریر

تو نے لیکن اے وطن مجھ کو دیا انعام خوب
زندگی کے دور آخر میں ہوا انجام خوب

اس کے بعد، فسادات کی تباہی اور غارت گری کا ذکر کر کے کہتے ہیں۔

محشر آرائی سے تیری جو ستم کش بچ گئے
بے سر و ساماں وہ نکلے ڈھونڈنے گھر کو نئے

ان میں شامل ہے مرا نور نظر آزاد بھی
تجھ سے کوسوں دور دہلی میں اماں جسکو ملی

اسکے نغمے بھی ہوئے تیری فضاؤں پر گراں
کس لئے تو ہو گیا اس درجہ ہم سے سرگراں

ہم نے یہ مانا ترے اپنے سخن ور کم نہیں
اپنے جانے سے تری بزم سخن برہم نہیں

ہم بھی تیرے ہی نوا سنج چمن تھے اے وطن
عندلیبِ نغمۂ حُبِّ وطن تھے اے وطن

اتحاد ہند و مسلم کے خواہاں ہم رہے
تیری بے انصافیوں پر بھی وفا پیماں رہے

تیری آزادی کے صدقے میں ہمیں ہجرت ملی
جذبۂ ذوق وفا کی ہم کو یہ قیمت ملی۔

یہ اقتباس کسی قدر طویل ہو گیا ہے لیکن محروم کے جذبات کا اندازہ کرانے کے لئے اسے پیش کرنا ضروری تھا پھر رفتہ رفتہ وقت زخموں پر مرہم رکھتا گیا۔ زخم مندمل ہوتے گئے۔ محروم نے اپنے "نئے وطن" کی خوبیوں کے راگ گانے شروع کر دیئے۔ حیرت یہ ہے کہ تقسیم سے بعد کی ان نظموں میں قومی حالات کی مسلمہ ابتری کی ہلکی سی بھی تنقید نہیں ملتی جس کی ہر دور کا سماج اپنے شاعر سے امید رکھتا ہے۔

مخدوم نے مظاہر قدرت پر بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ان چیزوں کا ذکر اردو شاعری میں پہلے بھی آتا تھا لیکن وہ اٹھارہویں صدی کی انگریزی شاعری کی طرح بہت کچھ روایتی اور کتابی ہوتا تھا۔ شاعروں کے ذاتی مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ نہیں تھا لہٰذا جب ہم اس طرح کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان باتوں کے بیان کرنے میں شاعر کے دلی لگاؤ کو بھی دخل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے جذبات یا خیالات کے اظہار کے لئے ان چیزوں کے رسمی تصورات سے استفادہ کر رہا ہے۔ اس بات کو شاعری میں تحریک اصلاح کے پیش رووں نے بھی محسوس کیا جس کا نتیجہ حالی کی "برکھا رت" ایسی نظمیں ہیں۔ اس طرح یہ خیال تو تسلیم کیا جانے لگا کہ قدرت کی منظر نگاری واقعیت پر مبنی ہونی چاہئے۔ شاعر کو ذاتی تجربات کی بنا پر مناظر قدرت سے متعلق نظمیں لکھنا چاہئے لیکن جس طرح اٹھارہویں صدی کے بعد انگلستان میں رومانی تجدید کے شاعروں مثلاً ورڈز ورتھ۔ شیلے اور کیٹس کو مظاہر قدرت میں انہماک تھا۔ یہ مناظر ان کے دلوں کے تاروں میں جس طرح لرزش اور آہنگ پیدا کرتے تھے۔ وہ ان اصلاح پسند شاعروں کے یہاں نہیں ملتا۔ ویسے ان انگریزی شاعروں کی ایسی نظمیں بھی پیش نظر نہیں تھیں۔ پھر فنی صلاحیت کی بات بھی ہے۔ جہاں تک مخدوم کا تعلق ہے انہوں نے انگریزی پڑھی تھی۔ انگریزی شاعروں کا بھی کچھ علم انہیں تھا۔ اس ضمن میں ورڈز ورتھ کے تتبع کی کوشش بھی غالباً انہوں نے کی۔ لیکن ایک تو انگریزی شاعری کا ان کا مطالعہ بہت وسیع معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر ہوتا بھی تب بھی ان رومانی شاعروں کی جذباتی لطافتوں اور نزاکتوں اور تخیل کی بلندیوں تک پہنچنا ان کے لئے دشوار تھا اردو شاعروں کا تو ذکر ہی کیا خود انگریزی شاعری وکٹورین عہد میں ان خصوصیات اور معیار کو برقرار نہ رکھ سکی۔

اس کے باوجود مخدوم کی اس نوع کی نظموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے اکثر میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس سے شاعر کے کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ بات تو ہے ہی کہ مخدوم کی مظاہر قدرت سے متعلق نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں جو اصلاحی دور کے شاعروں نے اپنے لئے قائم کیا تھا۔ یہ نظمیں ایسے عناصر سے قطعی پاک ہیں جنہیں واقعیت کے خلاف سمجھا جا سکے۔ پھر ان میں سے کئی میں شاعر کے ذاتی مشاہدہ کی تازگی بھی موجود ہے۔ اسلوب بیان میں خلوص کی جدت بھی ہے اور تاثیر بھی۔ مطالعے کی سہولت کے لئے ان نظموں کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے

مخدوم کی کچھ نظمیں تو ایسی ہیں جن میں شاعر کی توجہ فطرت کے مناظر و مظاہر کے حسن پر مرکوز رہی ہے۔ ان سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کو لطیف استعاروں اور تخیل کی نکتہ آفرینیوں میں رنگ کر پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں کی اہمیت زیادہ تر جمالیاتی ہے اگرچہ کہیں کہیں مظاہر قدرت کی افادی خصوصیات بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں بہار۔ اور بسنت پر کئی نظمیں۔ وقت سحر، ماہ تاباں "آفتاب" دھوپ۔ کوہ مری۔ خفتگانِ خاک سے شامل ہیں۔ اس کا اندازہ ان دو تین شعروں ہی سے ہو سکتا ہے جو نظم دھوپ سے نقل کئے جاتے ہیں

پاکیزہ مثل دامنِ پاکاں یہ دھوپ ہے   حسنِ عمل کی طرح درخشاں یہ دھوپ ہے

تصویرِ حسن، آب گہر سے دھلی ہوئی
یا ہے کوئی حسین حقیقت کھلی ہوئی
سرمایۂ نشاط ہے یہ دل پذیر دھوپ
قوت فزائے دل ہے کہ ہے جوئے شیر دھوپ

دوسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جن میں شاعر کا مقصد منظر نگاری کے سہارے کسی فلسفیانہ یا اخلاقی تصور کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خیال جذبے پر غالب آجاتا ہے اور مظاہر قدرت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں تو "شاعر" ماہتاب" ایسی نظموں میں ہی جن کی فضا حسن و جمال کے قمقموں سے جگمگاتی دکھائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی انسانی زندگی پر چھائی ہوئی غم کی تاریکی کا ذکر کر گزرتا ہے لیکن کچھ نظمیں تو لکھی ہی اس لئے گئی معلوم ہوتی ہیں کہ ان میں یہ بتایا جائے کہ زندگی انسانی روح پہ ایک بارِ گراں ہے۔ زندگی حباب و سراب ہے۔ فنا ہر شے کا مقدر ہے۔ جن چیزوں کا آغاز شاندار اور مسرت آگیں ہے ان کا انجام عبرتناک ہے۔ ایک نظم ہے " انجام گل"۔ جس کا مرکزی خیال ہی یہ ہے کہ " آغاز ہے دلنواز سب کا۔ انجام ہے دل گداز سب کا"۔ ایسی ہی ایک اور نظم "سبزۂ نو" ہے یہی خیال اس میں بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں۔

گلہائے لطف دنیا ہر چند چیدنی ہیں
نظارہ ہائے عالم دلکش ہیں دیدنی ہیں
لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے
افسوس دلکشی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے۔

اب ایک ایسی نظم لے لیجئے جس میں شاعر کا مقصد ایثار کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ خوبی اسے بوئے گل میں نظر آتی ہے۔ اس لئے اسے اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔

ریاضِ دہر میں خود ہو کے انتشار نصیب
مشامِ خلق کو تو نے کیا بہار نصیب
اجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تو نے
سبق زمانے کو ایثار کا دیا تو نے۔

ظاہر ہے کہ ان نظموں کا موضوع سنجیدہ ہے جسے مظاہر قدرت کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اب بھی یقیناً ایسے ہیں جنہیں یہ تصورات اہم معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نظمیں بھی انہیں قابلِ قدر محسوس ہوں گی لیکن دوسرے لوگوں کا ان سے زیادہ لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔

مجھے ان سے زیادہ دل کش وہ نظمیں محسوس ہوتی ہیں جن میں شاعر کی طبیعت میں جاگزیں غم مظاہر قدرت میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ اس طرح یہ داخلی اور خارجی افسردگی ہم رنگ و ہم آہنگ ہو کر ایسی نظموں کی فضا کو غم آلود بنا دیتی ہے۔ محروم کی زندگی میں کچھ غیر معمولی سانحات پیش آئے جس سے ان کی طبیعت میں رنج و ملال رس بس گیا۔ وہ کلیۃً قنوطیت پسند تو نہیں بن گئے لیکن ان کے مزاج پر سوز و گداز کا عنصر غالب آگیا اور ان کی نظر اداسی میں ایک طرح کا سکون خاطر محسوس کرنے لگی۔ اس کی جھلک ان کی نظموں " اترا ہوا دریا" اور " وادئ غم" میں نظر آتی ہے۔

اترے ہوئے دریا کو دیکھ کر شاعر کو وہ زمانہ یاد آجاتا ہے، جب یہ دریا چڑھا ہوا تھا، اس کی لہریں بلند ہو کر جوش

وخروش میں درختوں کو اکھاڑتی پچھاڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ لیکن اب وہی دریا ہے کہ اتر کر جوئے کم آب بن گیا ہے۔ اس کے کنارے قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ جس پر کچھ عجیب قسم کی اداسی برس رہی ہے۔ شاعر کے لفظوں میں۔ "ہو گئے دونوں کنارے پسلیاں بیمار کی"۔ اس لیے کو اور شدید بنانے والا خیال یہ ہے کہ وقت آنے پر یہ دریا ایک دن پھر اپنی کھوئی ہوئی قوت حاصل کرے گا۔ اس کی جوانی قدرت نے بطور امانت اپنے پاس رکھی ہوئی ہے جو کسی وقت پھر اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ لیکن واپس نہیں ملے گی تو انسان کی گزری ہوئی جوانی! اسی لئے ہے۔ شاعر بے تابی سے پوچھتا ہے

اے فلک! اے چاند تارو! اے فضاؤ! اے زمیں — کیا شباب رفتہ اپنا بھی امانت ہے کہیں۔

ایسی ہی ایک نظم "وادیٔ غم" ہے جہاں ہر وقت ماتم چھایا رہتا ہے۔ اس سے شاعر کی پژمردہ طبیعت ہم آہنگ ہے۔ شاعر اکثر اس کی سیر کو جایا کرتا ہے کیونکہ اس سے اس کی طبیعت کو سکون ملتا ہے۔

اک سکوت دائمی ہر شے پہ ہے چھایا ہوا — وقت پیدائش سے ہے ہر پھول مرجھایا ہوا
سیر اس وادی کی اکثر آ کے کر جاتا ہوں میں — میری نظروں میں یہ رہتی ہے جدھر جاتا ہوں میں

"گنج معانی" میں محروم کی چار نظمیں ہیں: "بلبل کی فریاد"، "چڑیا کی زاری"، "مچھلی کی بے تابی" اور "کولہو کا بیل"۔ ذکر ان کا پہلے بھی آچکا ہے۔ ان نظموں میں بھی بڑا سوز و اضطراب ہے، خصوصاً پہلی دو میں۔ لیکن ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ان سب میں کمزور، معصوم اور بے زبان جانوروں کے ساتھ انسان کے ظلم و ستم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یوں تو جانوروں پر رحم کا جذبہ کسی کے بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ محروم کی مخصوص "ہندو بیت" پر دلالت کرتا نظر آتا ہے۔ یہ چاروں نظمیں مظلوم کی فریادوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ جاذب توجہ "چڑیا کی زاری" ہے۔ کسی لڑکے نے جسے شاعر "بد نہاد اور نابکار" قرار دیتا ہے۔ شرارتاً بیچاری چڑیا کا گھونسلا توڑ ڈالا اور اس کے بچوں کو مار ڈالا۔ اس پر وہ نالہ کناں ہے۔ نظم کی عام فضا، چڑیا کے الفاظ، اس کے جذبات، اس کا لہجہ سب مل کر ہمیں عالی کی "مناجات بیوہ" کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔ منظر بڑا رقت خیز ہے۔ اپنے بچوں کو دیکھ کر چڑیا کہتی ہے۔

مٹی پہ وائے قسمت بیجاں پڑے ہوئے ہیں — کس نیند میں یہ میرے ناداں پڑے ہوئے ہیں
افسوس نسل انساں تجھ میں وفا نہیں ہے — کہتے ہیں اس جس کو تجھ میں ذرا نہیں ہے
غدار! بے وفائی تیری سرشت میں ہے — تیرا یہی وتیرہ دنیائے زشت میں ہے۔

اسی طرح بلبل قفس میں بے تاب ہے۔ پھر سے باغ کی کشادہ فضا میں اڑنے پھرنے اور خوشی سے چہچہانے کی حسرت اس کے سینے میں آگ لگا رہی ہے۔ مچھلی پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دی گئی ہے۔ جہاں وہ پڑی ہوئی بیمار تڑپ رہی ہے۔ کولہو کا بیل اپنی آزادی کھو کر تیلی کی غلامی پر مجبور ہے۔ وہ لگاتار گھومتے رہنے سے عاجز آچکا ہے۔ اس

زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے موت کی دعا مانگتا ہے۔

اب میں مظاہر قدرت پر کچھ ایسی نظموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو محروم کے انفرادی تجربات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لئے ان میں خلوص کا عنصر اور بھی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں ہیں "سندھ کو پیغام" اور "دریائے سندھ کی یاد" پہلی ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی تھی۔ جب انہیں سندھ سے جدا ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ دوسری اس سے اکتالیس سال بعد ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی جب محروم جمنا کے کنارے آکر آباد ہو چکے تھے۔ ذکر آچکا ہے کہ ان کا لڑکپن ایک ایسے مقام پر گزرا تھا جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ انہیں سندھ کے ساحل سے خاص شغف تھا جہاں وہ سیر کو جاتے تھے۔ اور دریا کی فضا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ قصبے کے غیر شاعرانہ ماحول سے نکل کر فکرِ شعر کے لئے بھی یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ بہرکیف یہ نظمیں شاعر کے بچپن اور جوانی کی دلکش یادوں پر مبنی ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ اُن کے بیتے ہوئے ایام کی کہانیاں گندھی ہوئی ہیں۔ اِن نظموں میں گردشِ ایام کو لوٹانے کی بڑی آرزو بھی ہے۔ سندھ کا ساحل چھوڑے ساٹھ برس بیت گئے ہیں۔ محروم دہلی آچکے ہیں، لیکن سندھ کی یاد بدستور دامن گیر ہے۔ حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہیں۔

اے سندھ تیری یاد میں جمنا کے کنارے — آنکھوں سے اُبل آئے ہیں احساس کے دھارے

پھر کہتے ہیں:۔

بھولا نہیں عالم تری امواج رواں کا — وہ ماضیِ رقصاں مری عمرِ گزراں کا۔۔
تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا — افسوس کہاں میں ہوں یہ قصّہ ہے کہاں کا۔
گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا — طفلی بھی، جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا۔

جن نظموں میں شاعر کی اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں جنہیں "گنجِ معانی" کے ایک باب میں "طوفانِ غم" کے عنوان سے جمع کر دیا گیا ہے۔ سر عبدالقادر نے بھی اس کتاب کے دیباچے میں انہی طرف توجہ دلائی ہے۔ محروم کی بیوی عین جوانی میں ایک چھوٹی سی بچی کو چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ اس سانحے سے ان کے دل پر جو گزری اس کا اظہار ان نظموں میں کیا گیا ہے۔ آپ بیتی ہونے کی وجہ سے ان میں غم کا بڑا گہرا احساس ملتا ہے۔ ان میں سوز و گداز کی چنگاریاں اور شدید چوٹ کھائے ہوئے دل کی ٹیسیں ہیں۔ چھوٹی سی بچی "ودیا" کی طفلانہ معصومیت اور نادانی کے پس منظر میں یہ حادثہ اور بھی جانکاہ بن جاتا ہے۔ ان میں دردناک منظر کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس کا یہ مقام دیکھئے جہاں نادان بچی ماں کی میت کے پاس پہنچتی ہے۔ اس امید میں کہ ماں حسبِ سابق اسے پیار کرے گی اور دودھ پلائے گی

گھٹنوں پہ چل کے نکلی، بستر کے پاس پہنچی — ننھے سے آہ، دل میں کچھ لے کے آس پہنچی
کیا مطمئن سنبھالے ہوش و حواس پہنچی — لیکن کچھ اس سے پہلے اے وائے یاس پہنچی

کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اٹھا کر — منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچی وہ لاڈلا کر
ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے — پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے۔
اب شمعِ کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈتی ہے — کیسے شکارہائے تقدیر ڈھونڈتی ہے
مردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے — مجھ سخت جاں پہ یارب! یہ کیا گزر رہی ہے؟

ان کے علاوہ محرومؔ کی کچھ اور نظمیں ہیں، جو ان کی زندگی کے واقعات اور ان پر اُن کے تاثرات کو نمایاں کرتی ہیں۔ "کنارِ راوی" سے ان کے والد محترم کے انتقال اور ان کے ذہن پر اس کے اثر کا پتہ چلتا ہے۔ "باپ کے آنسو" میں اسی "دیا" کی شادی کا ذکر ہے، جو ماں کی وفات کے وقت چھوٹی سی بچی تھی۔ پھر ایک اور نظم ہے "دیا کی خودکشی پر" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار بچے پیدا ہونے کے بعد دیا نے سسرال میں کسی رنجش کے باعث خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اس سے محرومؔ کے دل پر کیا گزری، اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس نظم کا پڑھنا ضروری ہے۔ ایک اور نظم "کم سن بچی کے مدفن پر" ہے۔ جس میں شاعر کی شیر خوار بیٹی شکنتلا کی موت کا ذکر ہے۔ بیٹی سے کہتے ہیں۔

خوش ہو کے پھر اچھل کہ جگن میرے ساتھ ہے — آنکھوں سے اس کے اشک ہیں جاری شکنتلا!
باپ اور بھائی دونوں تجھے لینے آئے ہیں — با آہ و اشک و گریہ و زاری، شکنتلا!

ان نظموں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محرومؔ کے مزاج میں جوشِ اصلاح، حبِ وطن، اور ذوقِ حرکت و عمل کے باوصف ایک طرح کی افسردگی، دنیا سے بے تعلقی۔ سوز و گداز اور کبھی کبھی جھنجھلاہٹ کے جو زیریں دھارے بہتے نظر آتے ہیں۔ محض اردو شاعری کی روایتی الم پرستی، قنوطیت اور کچھ فلسفیانہ تصورات ہی میں نہیں ہیں، بلکہ ان کی اپنی زندگی کے حادثات میں بھی ہیں جو ان کی شاعری کی فضا کو غم آلود بنانے میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر محرومؔ نے بچوں کے لئے بھی بہت نظمیں کہی ہیں جن میں سے کچھ "بہارِ طفلی" کے نام سے ایک مجموعے میں جمع کر دی گئی ہیں۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ گزشتہ صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے ربعِ اول میں عام اصلاح کی تحریک کی جو صورت تھی اس میں تعلیم و تدریس کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ نئی قسم کے اسکولوں کے نصاب کا سوال بھی پیدا ہوا۔ شمالی ہندوستان میں اردو کا بہت رواج تھا۔ اسی مقبولیت کے سبب اردو میں بچوں کے ادب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مقصد کے پیشِ نظر جو ادب تخلیق کیا گیا۔ اس میں جہاں بچوں کی مخصوص دلچسپی، سلاستِ زبان و بیان وغیرہ کا خیال رکھا گیا، وہیں یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ بچوں کی خاص ضرورتوں مثلاً ان کی دینی، اخلاقی اور شہری تربیت کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس وقت جن لوگوں نے بچوں کے لئے لکھا وہ مدارجِ عمر کے اعتبار سے بچوں کے ذہنی ارتقا اور نفسیاتی تنوع سے بخوبی واقف تھے۔ اور ہر درجۂ عمر کے بچوں کے لئے الگ الگ طرح کا ادب تخلیق کرنے پر قادر تھے لیکن اتنا صحیح ہے کہ بچوں کی عام ضروریات کا احساس انھیں تھا۔ جن شاعروں نے اس

غرض سے یا بچوں کو بہتر انسان بنانے کی نیت سے اچھی نظمیں لکھیں، ان میں حالی، اسمٰعیل، اقبال اور افسر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہی میں محروم کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لئے جو نظمیں انہوں نے کہیں، ان میں کچھ تو طبع زاد ہیں اور کچھ مقبول انگریزی شاعروں کے تراجم۔ یہ نظمیں اسلوب اور ٹیکنک کے اعتبار سے کئی طرح کی ہیں مثلاً کچھ ایسی ہیں کہ بچوں سے مشفقانہ خطاب کر کے انہیں نصیحتیں کی گئی ہیں۔ کچھ میں خود بچے اپنے ولولوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک نظم "بیبی کی رنی دلچسپ بھری" کہانی کے پیرائے میں ہے جس میں اسکول کے بچوں کو بوڑھوں اور اپاہجوں کی مدد کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ ان سب نظموں کے پڑھنے سے شاعر کی بچوں میں گہری دلچسپی اور ان سے مخلصانہ محبت کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کے دل میں انھیں ہنسی خوشی آپس میں پیار و محبت سے رہتے اور کھیلتے کھاتے دیکھنے کی تمنا موجزن ہے۔ وہ ان میں نیکی سچائی، ذوقِ علم، صحت و صفائی، محنت وطن دوستی اور خود اعتمادی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا متمنی ہے اور انہیں سستی، بدزبانی، خودغرضی، حسد، نخوت وغیرہ اخلاقی ذمائم سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کے لئے یہ نظمیں بھی شاعر کے عام اصلاحی مقاصد ہی کا ایک حصہ ہیں اور روحِ عصر سے مطابقت رکھتی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو پر دنیبر محروم کا اردو شاعری کے ارتقا میں ایک اہم مقام ہے۔ ان کی نظمیں گوناں گوں محاسن کی حامل ہیں۔ جس کا اعتراف نہ کرنا غلط بھی ہوگا۔ اور احسان ناشناسی بھی۔

(بقیہ صـ۳۴ کا)

معنی ایں شعر ہم در خاطر نمی آید۔ اگر شعر من می بود، ایں طور گفتم:۔

نکلے گی میری قبر سے آواز میرے بعد ۔۔۔ ایسی کہ سُن کے رو دیں گے ہمراز میرے بعد

محترم (الف) "شاعرِ خوش بیان خواجہ محترم خاں ..... از سلطنت عالمگیر ثانی فردوس آشیانی تشریف در صوبہ بہار می دارند"

(ب) "......... دو سال است کہ در ملک صوبہ بہار تشریف می دارند، در حق ایں فقیر مہربانی فرمایند ......"

خلیل (الف) "......... علی ابراہیم خاں .... از دست ...."

(ب) "......... الحال بہ مرشد آباد قیام می دارند......

قبل ازیں تذکرہ فارسی مرقوم فرمودہ اند۔ غالب است کہ تذکرۂ ریختہ ہم تحریر نمایند۔ از دست ......"

مندرجہ بالا اقتباسات کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نسخۂ اوکسفورڈ سے ایسے بیانات حذف کر دیئے گئے ہیں، جن سے شورش کی تذکرہ نگاری کا فطری جوہر کھلتا ہے۔ جون پور والے نسخے میں شورش اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس میں نہ تو ملمع کاری ہے اور نہ آورد۔ جو بات جہاں سے اور جس طرح معلوم ہوئی اس کا ذکر انہوں نے کر دیا۔ ضرورت اس کی ہے کہ دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند متن مرتب کیا جائے تاکہ تحقیقی کام کرنیوالے صحیح تر مواد سے واقف ہو سکیں۔

ابن انشا
ڈائرکٹر قومی مرکز کتاب

مصنف، ناشر اور قاری کے مسائل

نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کے مرکزی بورڈ نے، جس کا اجلاس ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو کراچی میں زیر صدارت جناب قدرت اللہ شہاب سکریٹری تعلیمات حکومت پاکستان منعقد ہوا، حسب ذیل امور کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کا نام "تعلقات مصنف ناشر قاری کمیٹی" ہے۔ یہ کمیٹی ملک کے اہل رائے ادیبوں، ناشروں، علمی اداروں، کتب خانوں کے منتظمین، طلبہ، والدین اور عام قارئین کی آرا جمع کر کے ایک رپورٹ پیش کرے گی جس کے اثرات دور رس ہوں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ ان امور پر اپنے خیالات اور نظریات قلمبند کر کے نیشنل بک سینٹر کے پتے پر جلد از جلد روانہ فرمائیں۔

مسئلہ اول:۔ تعلقات مابین مصنف و ناشر عام کتابوں (غیر نصابی) کی صورت میں۔

اس بحث میں حسب ذیل امور آ سکتے ہیں۔

۱۔ رائلٹی، معاوضے اور معاہدے وغیرہ کے سلسلے میں مصنفوں کے مسائل اور مطالبات، یعنی

(ا) عام ناشرین سے مصنف کے کیا مطالبات ہیں۔

(ب) سرکاری اور نیم سرکاری علمی اداروں اور دوسری کتابیں چھاپنے والی انجمنوں سے مصنف کس برتاؤ کا متقاضی ہے۔

۲۔ ناشرین اور علمی اداروں کو مصنفوں سے اگر کوئی شکایت ہے تو وہ کیا ہے اور مصنف سے انکے کیا مطالبات ہیں۔

۳۔ کوئی اور بات اس سلسلے میں۔

مسئلہ دوم:۔ نصابی کتابوں کے ضمن میں مصنف، ناشر اور حکومتی اداروں کے باہمی تعلقات

اس سلسلے میں حسب ذیل امور پر رائے زنی کی جا سکتی ہے۔

۱۔ نصابی کتابیں لکھنے والے مصنفین کے ٹیکسٹ بک بورڈوں سے کیا مطالبات ہیں اور بورڈ اپنی جگہ ان مصنفین سے کیا شکایت یا توقع رکھتے ہیں۔

۲۔ ٹیکسٹ بک بورڈوں کو ناشرین سے اور ناشرین کو ٹیکسٹ بک بورڈوں سے کیا شکایت ہے۔ باہمی معاملات میں انھیں

کیا دقتیں پیش آتی ہیں ۔

مسئلہ سوم: علمی اداروں اور مصنفین کے باہمی تعلقات اور ایسے اداروں کے خصوصی مسائل ۔

اس بحث میں حسب ذیل امور آسکتے ہیں ۔

۱۔ کتابوں کے لکھوانے، مرتب کرانے، چھپوانے اور فروخت کرنے کے سلسلے میں علمی اداروں کے کیا مسائل ہیں ۔

۲۔ مصنفوں کو علمی اداروں سے معاملت میں کیا دقتیں پیش آتی ہیں ۔

۳۔ اپنی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کے سلسلے میں علمی اداروں کے موجودہ طریق کار کے بارے میں مصنفوں کی کیا رائے ہے اور آئندہ دونوں فریقوں میں بہتر تعاون اور تعلقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے

مسئلہ چہارم: کتابوں کی قیمتوں کے بارے میں ناشروں اور کتابیں خریدنے پڑھنے والوں کا نقطۂ نظر ۔

اس مسئلہ پر اظہار رائے کی حدود یہ ہو سکتی ہیں ۔

۱۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں رائلٹی، کمپوزنگ یا کتابت، کاغذ، تزئین و تصاویر، چھپائی، جلد بندی، پبلسٹی وغیرہ پر کیا خرچ آتا ہے، بک سیلر کو کتنا حصہ ملتا ہے اور ناشر کا نفع کتنے فی صدی رہتا ہے ۔

۲۔ لائبریریوں اور بازار سے حسب ذیل قسم کی کتابیں حاصل کرنے میں عام قارئین اور بچوں کے والدین کو کیا دقتیں پیش آتی ہیں اور وہ کیا مداوا چاہتے ہیں ۔

(ا) بچوں کی عام کتابیں ۔

(ب) بڑوں کی عام کتابیں ۔

(ج) نصابی کتابیں ۔

۳۔ ان (ا) (ب) (ج) تینوں قسم کی کتابوں کے گٹ اپ، لکھائی چھپائی، پائیداری اور موجودہ قیمتوں کے سلسلے میں قارئین اور اور بچوں کے والدین کی رائیں کیا ہیں ۔

۱۔ ان سب امور پر رائے زنی ضروری نہیں۔ وہ مسئلہ لیجئے جو آپ سے متعلق ہے۔ آپ چاہیں تو آپ کی رائے کو خفیہ رکھا جائے گا۔

۲۔ آپ کی رائیں، مقالے، سفارشیں اور جوابات وغیرہ ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء تک حسب ذیل پتے پر پہنچ جانے چاہئیں

نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، تھیوسوفیکل ہال، بندر روڈ، کراچی ۔

مینا زیدی

ظریف جبلپوری

اردو[1] شاعری کے ابتدائی دور میں ظرافت نگاری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حالانکہ عربی اور فارسی شاعری اس نوع کے ذخیروں سے بھری پڑی تھی۔ ظرافت نگاری کی صف میں ہمیں سب سے پہلے جعفر زٹلی نظر آتے ہیں۔ اُن کی ظرافت محض تفریح طبع کے لئے تھی وہ اشعار صرف اس لئے کہتے تھے کہ سننے والے ہنس پڑیں اور بس۔

یہ جعفر زٹلی نے اچھا کیا
کہ مکھی کو مل مل کے بھنیسا کیا

جعفر زٹلی کے بعد ظرافت کی صف میں ہمیں "ہجو" دکھائی دیتی ہیں جسے بطور صنف سخن متعارف کرنے کا سہرا سودا کے سر ہے۔ محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔

"اُس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا غبار نکال لیتے تھے، یہ طرز خاص کہ جس سے "ہجو" ایک موٹا ٹہنا اس باغ شاعری کا ہو گئی۔۔ انھیں (سودا) کی خوبیاں ہیں۔ عالم، جاہل۔ فقیر۔ امیر۔ نیک۔ بد کسی کی داڑھی انکے ہاتھ سے نہیں بچی اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ ان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔"

سودا کے زمانے میں دوسرے ہجو گو فاخر، ضاحک اور فدوی بھی مشہور ہوئے مگر وہ سودا کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکے سودا کے بعد اکثر شعراء اس راہ پر گامزن ہوئے مگر جو ہجویہ نظمیں دستیاب ہوتی ہیں انمیں صرف انشا کا کلام معیاری سمجھا جاتا ہے ہجو کے علاوہ ظرافت نگاری میں تمسخر، پھکڑ پن، دشنام طرازی، فواحش ریختی اور سیدھی سادی ہزلیات مختلف زمانوں میں مختلف انداز میں تخلیق ہوئیں۔ ریختی میں جان صاحب اور ہزلیات میں چرکین وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔

ہر ملک کی سیاست کا اثر اُس ملک کی افراد، احساسات اور شعور پر یقیناً پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس ملک کا ادب اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کا مستقبل برصغیر میں اس قدر تاریک ہو گیا تھا کہ اگر سرسید جیسا مرد آہن

[1] یہ مقالہ یوم ظریف (۴ مارچ ۶۷ء) میں پڑھا گیا۔

اپنی علی گڑھ تحریک لے کر نہ اُٹھ کھڑا ہوتا تو خدا معلوم یہ قوم آج کس قعرِ مذلت میں پڑی ہوتی مگر یہی وہ وقت تھا جب کہ مسلمانوں کی نام نہاد مذہبی کورانہ تقلید اور اُن کے ذہنوں میں اُس وقت اسلام کا تصور سرسید تحریک کو بہ آسانی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سرسید کے خلاف ایک عام بغاوت پھیل گئی۔ کفر کے فتوے جاری ہو گئے اور اُن کی تحریک کو مغربی تہذیب اور معاشرت کا ایسا زہر قرار دیا گیا جو مسلمانوں کو بے دین کر کے سوائے دوزخ کے کوئی دوسری راہ نہیں دکھا سکتا۔ سیاسی عقائد والے انھیں ایک مخصوص طبقہ غدارانہ ذہنیت کا حامل سمجھنے لگے۔ عام تصور یہ تھا کہ اسلام انگریزی تعلیم کو برداشت نہیں کر سکتا اور یہ کہ انگریزی تعلیم مسلمان کو کافر بنا دیتی ہے۔ سرسید کا کہنا تھا کہ اگر اس وقت ملک کے مسلمانوں کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تعلیم نہ دی گئی تو یہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔ اسی زمانے میں ایک شاعر منظرِ شہود پر آیا جسے ہم اکبر الٰہ آبادی کے نام سے جانتے ہیں۔ اکبر کا ذہنی رجحان بھی عام مسلمانوں کے خیالات کے مطابق تھا۔ انھوں نے انگریزی تہذیب اور سرسید تحریک کی مخالفت میں طنز و مزاح کا سہارا لیا اور یہ سمجھایا

ملک برٹش کا راج ہند میں تھا اب خدا ہی بھائی صلو کا

غرض کہ سرسید علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کی اکبر نے اچھی طرح دھجیاں بکھیریں اور وہ اپنے رنگ میں اس قدر مقبول ہوئے کہ اردو شاعری میں ایک نئی صنف کے موجد قرار دیئے گئے۔

اچھے شعرا نے طنز کا سہارا تو لیتے کلام میں ہمیشہ لیا ہے شیخ کی داڑھی انکے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی۔ مگر ظرافت کو طنز میں اور طنز کو ظرافت میں سمو دینے کے موجد صرف اکبر تھے۔ انھوں نے عوام اور حکومت، دونوں کی نبض کو پہچانا اور معاشرے پر بھرپور طنز کئے۔ آخر میں اکبر بھی سرسید پر ایمان لے آئے تھے اور سرسید کی وفات پر انھیں کہنا پڑا کہ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کا ادب پر یہ اثر ہوا کہ ملک نے ہر اُس مزاحیہ شاعری یا ظرافت نگاری کو ادب سے خارج کر دیا جس میں کوئی اصلاحی افادیت کارفرما نہ ہو۔ چنانچہ جب اکبر کے بعد ظریف دہلوی، احمق پھپھوندوی، ظریف جبلپوری، سید محمد جعفری جیسے فنکار نمودار ہوئے تو ادبی دنیا نے اُنکی تخلیقات کو زمانہ کے تقاضوں کی کسوٹی پر پرکھا۔ ظریف لکھنوی کے متعلق غلام احمد فرقت لکھتے ہیں۔

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی، حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ مگر چونکہ ان کی زندگی نوابانہ فضاؤں میں بسر ہوئی تھی اس لئے سیاست سے انھیں دور کا لگاؤ بھی نہ تھا۔ اُنکی شاعری محض تفریحی شاعری تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر وہ شاعری جس کا مقصد محض تفریح ہو۔ ادب میں کسی اعلیٰ مقام کی اہل نہیں ہو سکتی۔"

ظریف دہلوی کا کلام بھی مزاح اور تفریحِ طبع کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ احمق پھپھوندوی نے البتہ کہیں کہیں حکومت اور سماج پر بھرپور طنز کئے ہیں۔ اُنکے مزاج میں بلا کی سنجیدگی تھی وہ قہقہے کے قائل نہ تھے وہ صرف مسکراتے تھے مگر خلافت اور کانگریس کی سرگرمیوں اور اقتصادی پریشانیوں نے انھیں کبھی یکسوئی سے کام نہ کرنے دیا اور وہ اردو ادب کو وہ سب کچھ نہ دے سکے جو حقیقتاً دے سکتے تھے نتیجہ پیدا ہوا کہ اُنکی تخلیقات زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں اور وہ اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر وفات پا گئے۔ اور اُن کا وہ مقام متعین نہ ہو سکا

جس کے وہ حقیقتاً اہل تھے۔

ظریف جبلپوری کو سمجھنے سے قبل ہمیں اُس ماحول کا جائزہ لینا چاہیئے جس میں اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ گذرا ہے۔ اُن کی زندگی ملک کی سیاسی بدحالی اور تقسیم کی افراتفری سے متاثر رہی۔ وہ انسانی نفسیات کے ماہر تھے اور قوم کے زبردست نباض۔ اُن کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو دیکھ لیتی تھی۔ جو قوم کے ذہن و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتی تھیں وہ جو کچھ دیکھتے اور سمجھتے تھے وہی لکھتے تھے۔ اُن کے کلام میں نرم مگر بھرپور طنز ہوتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اُن کے تمام کلام میں طنز آباد ہے اور مزاح کم۔ وہ بدحالیوں اور بد اعمالیوں کے رثیوں میں قہقہے پیدا کرتے تھے۔ قہقہے ختم ہو جاتے تھے۔ مگر طنز اپنا کام جاری رکھتا تھا۔ اُن کے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل اُن کے حملوں سے کبھی محفوظ نہ رہے۔

ظریف مرحوم نے دو مطبوعہ دیوان "فرمان ظرافت" اور "تلافی مافات" اور بہت سا غیر مطبوعہ کلام چھوڑا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام اکثر و بیشتر ہم خود اُن کی زبان سے بھی سن چکے ہیں اگر قوم نے توجہ نہ کی تو ممکن ہے یہ جواہر پارے ضائع ہو جائیں۔ اُن کے دونوں مطبوعہ دیوانوں میں تقریباً سوا دو سو طویل اور مختصر نظمیں موجود ہیں۔ پورے کلام میں ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے اندازہ ہو کہ اُن کی شاعری محض تفریحی اور صرف مزاحیہ شاعری تھی۔ اُن کی نظم "لالو کھیت" کراچی کی آبادکاری پر ایک ایسا بھرپور طنز ہے جسے برداشت کرنا ارباب حل و عقد کے لئے دشوار ہو گیا ہوگا اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہ نظم نہ لکھی گئی ہوتی تو ممکن ہے اُس وقت کا لالو کھیت آج کا بارونق اور دلکش لیاقت آباد نہ ہوتا۔

جگمگائیں بلب امیروں کے دولت خانوں میں
ٹمٹماتا ہے چراغ خانہ لالو کھیت میں

تم کو اپنی کوٹھیوں کے آٹھ کمروں کی قسم
اک چٹائی کا مکاں بنوانا لالو کھیت میں

ہم نشیں آبادکاری جس کو کہتے ہیں عوام
سولہ آنے میں نہیں ایک آنہ لالو کھیت میں

تم کو جو تکلیف ہے شاید انھیں احساس ہے
کچھ بڑے لوگوں کو دو عرصہ لالو کھیت میں

اس اقتباس سے اندازہ فرمایئے کہ شاعر نے مہاجرین کی آبادکاری پر ارباب حل و عقد کی غفلت کا اپنے قلب پر کیا اثر لیا ہوگا۔ جب مزاح میں طنز کا نشتر ڈھال کر یہ نظم لکھی ہوگی۔

اصحاب اقتدار و اختیار کی سرد مہریوں کا مرثیہ حسب ذیل اشعار میں کتنا مکمل اور واضح ہے۔

ہم گئے ملنے تو ہوئے وہ خوش بہت تعظیم کی
اور باہر ہم کو صوفے پر بٹھا کے چل دیئے

اور مقطع فرماتے ہیں۔

جب بھی حرفِ مدعا نکلا زباں سے لے ظریف

مسکرائے اور ہمیں ٹھینگا دکھا کر چل دیئے

ظریف مرحوم کے کلام کا اگر مکمل جائزہ لیا جائے تو اس کے لئے ایک دفترِ بے پایاں درکار ہوگا۔ وہ اور اُن کا کلام ہم سب کا جانا پہچانا ہے اس لئے میں کلام پر مزید تبصرے کی طوالت سے گریز کرتے ہوئے صرف اس قدر اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظریف ایک انتہائی شریف، خود دار اور ضبط و تحمل کا قائل انسان تھا۔ وہ کسی سخت سے سخت موقع پر اپنے سطح سے نیچے نہیں گرا اور وہ کہہ اٹھا۔

بیجا نخرے کبھی اٹھاتے ہی نہیں

اندازِ خوشامد ہمیں آتے ہی نہیں!

جتنے وہ ہیں اُتنی اُتنی تعریف

رائی کا پہاڑ ہم بناتے ہی نہیں

ظریف کو حوادثِ زمانہ کا بارہا سابقہ پڑا مگر بجائے قنوطیت اور آہ و زاری کے انھوں نے قہقہے لگا کر دنیا کا مقابلہ کیا اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا وہ اپنے غموں پر ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے مگر آج سے تین سال قبل اجل کے ہاتھوں نے انھیں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ اُن کی یادیں ہماری آنکھوں کو ہمیشہ اشک آلود رکھیں گی اور ان کا کلام غیر فانی ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آخر کلیس انھیں اُسی محفل میں جگہ دے گی جہاں اکبر الہ آبادی اور سید محمد جعفری ہوں گے۔ میں یہ مقالہ اُس قطعۂ تاریخ پر ختم کرتا ہوں جو میں نے مرحوم کے انتقال پر کہا تھا۔

خلوص اور صدق میں تھے کتنے منفرد ظریف

نہ اُن کا تھا کوئی رقیب، نہ اُن کا تھا کوئی حریف

خدا نے جب بلالیا، قضا کو بھیج کر انھیں

نہ کوئی ساتھ دے سکا اگرچہ تھے سبھی حلیف

سُنی وفات کی خبر، تو آئی غیب سے ندا!

لکھو یہ مینا قبر پر کہ "خلد میں گئے ظریف"

۱۹۶۳ء

دیوانِ وصف :- یہ ایک گمنام مگر نغز گو شاعر کا دیوان ہے۔ سوز و گداز اور اندازِ بیان کے اعتبار سے
عبدالحی وصف — وصف کا کلام ممتاز مقام رکھتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

گلدستہ نہال سخن بریلی

حکیم فصیح الزماں اثر امروہہ ضلع مراد آباد کے ساکن اور طبیب و شاعر تھے۔ شاید امروہہ میں مطب نہیں چلا اور وہ بریلی چلے آئے انہوں نے بریلی میں حکیم وزیر علی کی گلی میں مطب کرنا شروع کیا۔ مطب خوب چلا اور وہ شہر میں مشہور ہو گئے۔ بریلی میں شعر و شاعری کا ماحول بنا ہوا تھا۔ حکیم فصیح الزماں اثر سید ابو الحسین شمیم امروہوی (متوفی نومبر ١٩١٤ء) کے شاعری میں شاگرد تھے۔ وہ بھی اس ماحول میں پیوست ہو گئے اور شہرت حاصل کی۔

بریلی میں اخبارات، رسائل اور گلدستہ ہائے غزلیات کا رواج بڑھ چکا تھا۔ روہیلکھنڈ گزٹ بہار بے خزاں اور روز افزوں نے اس صدی کی پہلی دہائی میں شہرت حاصل کی تھی۔ امروہہ سے اتحاد نکل رہا تھا۔ جلوہ یار، پیام یار، بزم سخن، خدنگ نظر کے پھریرے اڑ رہے تھے۔ حکیم اثر نے اخبار الفصیح بریلی کا اجرا کیا جو کچھ ایسا معیاری پرچہ تو نہیں تھا۔ مگر اس کی کوکھ سے نہال سخن پیدا ہوا جو حکیم اثر کا بریلی والوں پہ ایک بڑا احسان ہے۔

نہال سخن کا پہلا شمارہ جنوری سنہ ١٩١١ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مالک اور مہتمم حکیم فصیح الزماں اثر اور اڈیٹر محمد حسین محو بدایونی تھے۔ گلدستہ اخبار الفصیح کے ہمراہ ہر ماہ انگریزی کی تین تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کی طباعت منتخب العلوم بریلی میں ہوتی تھی۔ ابتدا میں تعداد صفحات ٢٤ تھی جو بڑھا کر ٣٢ کر دی گئی تھی۔ لکھائی چھپائی اوسط اور درمیانی درجے کا کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ رسالہ تھم منظر کیا گیا تھا سر ورق اس زمانے کے مذاق کے مطابق دیدہ زیب تھا اور اس پر یہ شعر درج کیا جاتا ؎

سن لئے نالے جو مجھ ناکام کے بیٹھ جائے گے کلیجہ تھام کے

مئی ١٩١٤ء سے سر ورق زیادہ دیدہ زیب بنایا گیا۔ اُسی سال مفتی عماد الحسن محو بریلوی اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اب یہ شعر درج کیا جاتا ؎

سرسبز کیوں نہوں کہ نہال سخن ہوں میں جس کو خزاں کا خوف نہیں وہ چمن ہوں میں

ابتدائی اوراق اخبار الفصیح پر مشتمل تھے اس کے بعد گلدستہ بطور ضمیمہ شروع ہوتا تھا۔ گلدستے میں غزلیات مصرعہ طرح پر چھپا کرتی

تھیں۔ جس کا اعلان دو تین ماہ قبل کر دیا جاتا تھا۔ غزلیات کی طباعت میں حفظ مراتب کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ عام طور پر گلدستے میں پہلی غزل شمیم امروہوی یا خود حکیم اختر کی طبع ہوتی تھی۔ اساتذہ آخری صفحات پر بھی جگہ پاتے تھے۔ گلدستے کے آخری صفحے پر دستور العمل مشتہر ہوتا جس میں اس کے ضوابط بیان کئے جاتے جو مختصراً مندرجہ ذیل ہیں اور جن سے حکیم اختر کی سوجھ بوجھ اور نہال سخن کی متعلق واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۔ یہ گلدستہ ۲۴ صفحوں پر ہر ماہ انگریزی کی تیسری تاریخ بجمعہ اخبار الفصیح ہو کر شائع ہوتا ہے۔ عام قیمت اہل شہر ایک روپیہ خریداران بیرونجات سے ۱۲/ مربیان سے ۵/ معاونین سے ۵/ سرپرستان سے ۱۰/ والیان ملک جو کچھ عطا فرمائیں۔ اساتذہ کو مفت نذر کیا جاتا ہے۔ پرچہ نمونہ ۲/۔

۲۔ کلام خریدار و غیر خریدار دونوں منتخب شائع ہوگا لیکن خریدار کو اس قدر ترجیح ہوگی کہ اس کے ۱۶ اشعار تک درج گلدستہ کئے جا سکتے ہیں۔ غیر خریدار کے ۱۱ اشعار سے زائد درج نہیں ہو سکتے۔

۳۔ اساتذہ شہر و بیرونجات نمبر ۲ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے ۲۱ اشعار بلا انتخاب درج ہوں گے۔

۴۔ معاونین طرح میں ۲۱ اشعار تک چھپوانے کے مجاز ہیں۔

۵۔ مربیان دو غزلیں ایک طرحی دوسری غیر طرحی ہر ماہ میں چھپوانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

۶۔ مشاہیر کی خدمت میں گلدستہ بلا طلب پہنچتا ہے۔ بحالت نادہندگی اگر نوبت بعدالت پہنچی تو قیمت بشرح اول دس روپے سالانہ کے حساب سے وصول کیا جائے گا۔

۷۔ غزل اجرتی خریداران گلدستہ کی فی شعر آدھ آنہ اجرت پر بلا انتخاب درج گلدستہ ہو سکتی ہے غیر خریداران سے ۱/ فی شعر لیا جائے گا۔

۸۔ غزلیں صاف خوشخط علیحدہ کاغذ پر آنی چاہئیں۔

۹۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام حکیم محمد فصیح الزماں اختر منیجر اخبار الفصیح و نہال سخن ہونا چاہئیے۔

ان ضوابط سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ حکیم اختر کی نظر میں گلدستے کے ذریعہ مالی بازیافت بھی تھی۔ انہوں نے گلدستے میں اپنی دواؤں کے اشتہارات بھی چھاپے۔ انہوں نے ایسے شعراء کی غزلیات بھی زیادہ شائع کیں جن سے مالی منفعت متوقع تھی۔ گلدستے میں شہر بریلی کے ان تمام شعرا کا کلام پابندی سے چھپا جو رئیس یا زمیندار تھے۔ ان کے علاوہ بیرونجات کے مالدار شعرا کی غزلیات بھی شائع ہوئیں۔ ان کے اسماء معاون مربی اور سرپرست کی حیثیت سے درج کئے جاتے تھے۔ والیان ریاست میں راجہ صاحب محمدی (ضلع کھیری۔ یوپی) اور نواب صاحب ٹونک کی غزلیات طبع ہوئیں۔ بحیثیت مجموعی گلدستے کے سرپرستوں اور معاونین کی فہرست طویل تھی اور ان کا کلام بار بار چھپتا تھا۔ اس سے حکیم اختر کی کاروباری لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نہال سخن پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور اس نے کم وقت میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ البتہ مالی فروغ سے ادبی فروغ متاثر ہوا۔ گلدستے میں ایسے روساء کا کلام بھی چھپا جن کی ادبی حیثیت معمولی تھی۔ اساتذہ نے اپنے تلامذہ کی غزلیں بھی چھپوائیں جو کم قیمت تھیں۔ معززین شہر کے نو عمر لڑکوں کی غزلیات بھی طبع ہوئیں جو ان کی اپنی کاوش کا نتیجہ نہیں تھیں۔ ظرافت کے نام پر لچر اور سوقیانہ کلام بھی چھپا جو بالکل نہ چھپتا تو بہتر تھا۔ چند ماہ تک قصبہ رچھا (ضلع بریلی) کے شعرا کا نہال سخن پر قبضہ رہا اور کم و بیش ۲۰ شاعروں کی غزلیں طبع ہوئیں حالانکہ ان رچھاوی مربیوں میں صرف دو شاعر تھے یعنی حکیم محمد بشیر خاں بشیر و مولوی نذیر خاں نذیر اور دیگر شعرائے کرام کی افراط سے نسبت نہیں تھی۔ مگر

یہ سب مال دار تھے۔ حکیم اثرؔ نے انہیں گلدستے کا سرپرست و معاون بنایا اور ان کی غزلیات شائع کیں۔ مبتدی شعرا کی افراط سے گلدستے کی ادبی حیثیت کچھ خسارے میں رہی۔

حکیم اثرؔ کی اس پالیسی کی وجہ سے گلدستے میں ادبی و تاریخی مضامین بھی نہیں چھپ سکے۔ حالانکہ ان کے زمانے کے شائع ہونے والے گلدستوں میں ادبی مضامین کو جگہ دی جاتی تھی۔ ابتدا میں یہ کمی الفصیح نے پوری کی مگر جیسے جیسے نہالِ سخن نے ترقی کی الفصیح کا معیار گرتا چلا گیا۔ اور بالآخر فروری سنہ ۱۹۱۱ء میں جب نہالِ سخن طبع ہوا۔ تو وہ الفصیح سے بے نیاز تھا۔ نہالِ سخن میں طرحی غزلیات شائع ہوتی رہیں۔ اور وہ کوئی ادبی و تاریخی مضمون نہیں پیش کر سکا۔

مطالعہ نہالِ سخن سے تین امور وضاحت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ گلدستہ روہیلکھنڈ کا نمائندہ رسالہ تھا اور اس کے ذریعے بالعموم شعرائے روہیلکھنڈ منظر عام پر آئے۔ ہم نے شعرائے روہیلکھنڈ کی ایک مختصر فہرست تیار کر لی ہے تاکہ کوئی صاحب مقامی شعرا پر مضمون مرتب کرنا چاہیں تو انہیں نہالِ سخن سے غزلیات مل جائیں۔ مختصر فہرست شعرا یہ ہے۔

فرحت اللہ فرحت تلہری تلمیذ داغ۔ حیات بخش رسا رامپوری تلمیذ داغ۔ عطا حسین احمد بیباک شاہجہانپوری۔ تلمیذ داغ۔ تصدق حسین قرار شاہجہانپوری۔ تلمیذ داغ۔ نواب ناظم علی خاں ہجر شاہجہانپوری تلمیذ داغ۔ احمد اللہ عاجز سنبھلی تلمیذ داغ۔ عطا محمد عطا بدایونی تلمیذ داغ۔ افضال احمد بسمل بدایونی تلمیذ امیر مینائی۔ مولوی شرف الدین آلم بچھرایونی (ضلع مرادآباد) تلمیذ مومن خاں مومن۔ محمد عبدالحی شیدا بدایونی تلمیذ مضطر خیرآبادی۔ محمد حسن اختر بدایونی۔ مناظر الحسن بدایونی۔ مفتی ریاض الحسن گہر بدایونی۔ سجاد حسین سجاد بدایونی۔ محمد حسن محسن بدایونی۔ محمد حسین سحر بدایونی۔ عبدالجامع جامی بدایونی۔ مرزا وہاب الدین طالب بدایونی۔ مفتی اکرام احمد لطف بدایونی۔ ابوالمظفر مظفر بدایونی۔ محمد مبین نازش بدایونی۔ سید عنایت احمد تحسین بدایونی۔ خلیل احمد حسن حافظ پیلی بھیتی۔

۲۔ یہ گلدستہ بریلی کا نمائندہ رسالہ بھی تھا اور اس کے ذریعے بالخصوص شعرائے بریلی منظر عام پر آئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہالِ سخن کے اوراق میں بریلی کے ایک دور شاعری کی تاریخ محفوظ ہے۔ شعرائے بریلی کی فہرست پیش کرنا اس لئے غیر ضروری ہوگا کہ میں خود گزشتہ پانچ سال سے تذکرہ شعرائے بریلی مرتب کر رہا ہوں۔ اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہالِ سخن نے بریلی کے کس شعری ماحول کی عکاسی کی اور کن اساتذہ کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا۔ اس سلسلے میں صرف تین شاعروں کا تذکرہ کافی ہوگا کیونکہ انہوں نے اس عہد میں بریلی کے مختلف النوع شعری ماحول کی نمائندگی کی ہے۔ ان میں سب سے اول حسن رضا خاں حسن (۱۸۰۶ تا ۱۹۰۸) تلمیذ داغ کا نام لینا پڑے گا کیونکہ انہوں نے فصیح الملک کے رنگ شاعری کو فروغ دیا۔ بعد انتقال ان کے تلامذہ مثلاً نانک چند عبرت، دوارکا پرشاد علم، حمید اللہ خاں حمید وغیرہ اسی رنگ کی پرورش کرتے رہے۔ شہر کہنہ بریلی میں مرزا رستم یار بیگ قیصر (متوفی ۱۹۳۰ء) تلمیذ نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی (م ۱۲۰۰ھ ۱۲۰۹ء) کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کے بے شمار تلامذہ تھے۔ ان کا تمام گھر شاعر تھا۔ ان کی شاعری میں تلاش مضمون، پرواز تخیل، ندرت بیان اور فنی پختگی کی صفات ملتی تھیں۔ وہ بڑے سے بڑا ہجو لکھا کرتے تھے۔ ان کا قافیہ کبھی تنگ نہیں ہوا۔ ان کی ردیف نے کبھی سستی نہیں دکھائی۔ مگر ان کی غزل جذبات کے تبسم، غم کی آگ، حسن کے نکھار اور طرز ادا کی ... سے عاری ہے۔ ان کے رنگ شاعری کو بھی فروغ ہوا۔ ان کے پسر مرزا احمد یار بیگ احمد (متوفی ۱۹۴۱ء) آخر دم تک اس رنگ کو اپناتے رہے۔ مفتی عماد الحسن محو مفتی سلطان حسن تلمیذ غالب کے صاحبزادے، شہر کے بڑے رئیس اور صاحب علم و فضل انسان تھے۔ ان کے خاندان میں ایک درجن سے زائد شاعر تھے۔ ان میں بشیر صاحب دیوان تھے۔ بزرگوں کو غلام رسول اللہ بسمل تلمیذ غالب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ بعد کی نسل محو سے وابستہ تھی۔ انہوں نے "بزم ادب"

کی بھی تشکیل کی تھی جو نصف صدی تک قائم رہی۔ اس کے مشاعروں میں حکیم آثر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ محو ایک انفرادی رنگ کے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی غزل کو داغ و امیر کے اثرات سے بچائے رکھا۔ انھوں نے مضمون طرازی اور قافیہ پیمائی سے بھی اجتناب کیا۔ ان کی غزل جذبات کی تالیف، مشاہدات کی ترتیب اور خیالات کی تطہیر سے عبارت ہے۔ ان کے ماحول کی اعلیٰ روایات اور دبستانِ غالب کی انمٹ اقدار کو ان کی فکر اور شخصیت نے یکجا کر دیا ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار میں کچھ ایسا تقدس اور کچھ ایسا داخلی نور ملتا ہے جو ان کی غزل کو بھاری بھرکم اور دلآویز بنا دیتا ہے۔ نہالِ سخن کی ہم طرح غزلیات میں تینوں رنگ واضح اور اجاگر ہیں۔ تلامذہ حسن، قیصر، اور محو کی غزلیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا اندازِ تکلم واضح اور ممتاز۔ نہالِ سخن کے اوراق میں بریلی کی شعری تاریخ کا یہ دور بلا شبہ محفوظ ہے۔

۳۔ عوام داغ کے اندازِ شاعری کے دلدادہ تھے اس وقت بریلی میں "زبان کے شعراء" کی واہ واہ ہوتی تھی۔ مشاعروں میں تلامذہ حسن، شیخ احمد غوری، تلمیذ داغ اور ان کے شاگردوں کا کلام مقبول ہوتا تھا۔ اس مقبولیت کا اثر دوسروں پر پڑنا ناگزیر تھا۔ قیصر اور محو تو متاثر نہیں ہوئے۔ مگر دیگر شعراء نے یہ اثر قبول کیا۔ محو کے خاندان میں مفتی بدرالحسن نغمہ جو رشتے میں ان کے چھوٹے بھائی تھے وقتی ماحول سے متاثر ہوئے اور ان کی غزلیات کی تمکین داغ و امیر سے مستعار ہے۔ قیصر کے خاندان میں ان کے دو لڑکے مرزا سعادت یار بیگ سحر اور مرزا یعقوب بیگ حسرت اسی ڈگر پر چلے اور پروازِ تخیل کے بجائے مشاہدہ وصل پر تکیہ کیا۔ جس طرح برف پگھل کر پانی بن جاتا ہے اسی طرح بریلی کے شعراء داغ کی ہوا لگنے سے رفتہ رفتہ پگھل کر داغ کے رنگ میں گھل مل گئے۔ اس عام شعری کیفیت کا نقشہ بھی نہالِ سخن میں ملتا ہے۔ بریلی کے زیادہ تر مقامی شعرا کا کلام بتدریج داغ سے متاثر ہوا۔ اور اس رنگ کی غزلیں نہالِ سخن میں شائع ہوئیں۔

پرانے گلدستوں میں، جیسا کہ نہال سخن تھا، اکثر مفید معلومات مل جاتی ہیں۔ مثلاً جون ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں قاضی عبدالرحمٰن وحشی بریلوی تلمیذ غالب کی مندرجہ ذیل غزل چھپی ہے ؎

جاں فروشی کا اگر دعویٰ عدو کرتے ہیں — لیجئے ہم بھی تہِ تیغ گلو کرتے ہیں
چاٹ یہ حضرت واعظ کو پڑی ہے مے کی — ہم اگر جام تو خالی وہ سبو کرتے ہیں
آپ جو چاہیں کہیں آپکی بیجا بھی بجا — غیر کیوں آپ کی باتوں پہ رفو کرتے ہیں
تشنۂ شوقِ شہادت ہیں بلا کے جانباز — آپ شمشیر سے تر اپنا گلو کرتے ہیں
زخم سوزن سے بچے کچھ کچھ اثر نوکِ مژہ — لبِ زخم اس لئے ارمان رفو کرتے ہیں
ہاتھ آیا مجھے اس پردہ نشیں کا دامن — جسکو لینے کو فرشتے بھی وضو کرتے ہیں
نہ نگہ جلوہ پرست ان کی نہ دل مایۂ عشق — کیوں مرا راز سبک بھولے سے مدد گو کرتے ہیں
کیوں نہ ہوں پشت فلک خم شدہ تا نذر میں — بود و باش اس پہ جو بیا آئینہ رو کرتے ہیں

کہیں وحشی کی نمازیں بھی قضا ہوتی ہیں
میکدے میں وہ گلابی سے وضو کرتے ہیں

اس سے قبل ہماری قاضی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

داغ کے بعض تلامذہ کا بیان ہو چکا ہے۔ چند کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں۔

محمد یوسف حسن طپش۔ حب لعل رعد۔ بیعنڈ گو ایار۔ متین الدین مجلی شہر جونپور۔ محمد حسین حیران۔ اکبر آباد۔

نہالِ سخن میں امیر مینائی کے مندرجہ ذیل غیر معروف تلامذہ کی غزلیات شائع ہوئیں

سید قمر الدین احمد قمر سندیلوی۔ حکیم محمد عابد علی کوثر خیر آبادی۔ بالکرشن قمر لکھنوی۔ حضور احمد خان آثم بریلوی۔

نہال سخن کے ذریعہ مندرجہ ذیل اخبارات، رسائل اور گلدستوں کے اسماء معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں دو ایک معروف ہیں:۔

۱۔ اخبار "زمیندار و کاشتکار" بجنور۔

۲۔ رسالہ "تحقیقِ سخن" گیا

۳۔ اخبار "الاسلام" لاہور

۴۔ ظریف لاہور

۵۔ اخبار "تاجر" میرٹھ۔ مدیر محمد ابن الحکیم صبر

۶۔ "جلوہ یار" میرٹھ۔ مدیر محمد شریف خاں آزاد

۷۔ "زبان اردو" شاہجہانپور۔ مدیر محمد شاہ جہانپوری۔

۸۔ اخبار اتحاد امروہہ مراد آباد۔ ۹۔ بہارِ سخن کلکتہ۔

نہال سخن میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اشتہار چھپا یا ریویو کیا گیا

۱۔ روامر روزی

۲۔ بدر یہ العشرت

۳۔ تحفۃ العلوم

۴۔ رسالہ علم قیافہ

از حکیم فصیح الزمان اثر

۵۔ کتاب الکتاب و منظوم طرابلس — از محمد اسمٰعیل خاں تحبیر رامپوری۔

۶۔ اوراق ماتم تسلیم یعنی یادگار تسلیم — ایضاً

۷۔ گلدستہ قرار۔ — از تصدق حسین قرار شاہجہانپوری

۸۔ سفینہ نوح۔ — محمد نوح نادری

میں نے نہال سخن کے جس فائل سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اکتوبر ۱۹۱۵ء تک کے شماروں پر مشتمل ہے اس وقت یہ نہیں معلوم کہ نہال سخن کا آخری شمارہ کس تاریخ میں چھپا۔ ۱۹۱۵ء کے رسالوں میں پہلا سا طمطراق نہیں ہے۔ دو ایک شمارے وقت پر بھی نہیں نکلے صفحات کی تعداد بھی ۳۲ سے کم ہو کر رہ گئی۔ خریداروں اور معاونین کے نام بھی کم ہیں ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گلدستہ مائل بہ زوال تھا۔ میں نے شہر بریلی کے معمر لوگوں سے دریافت کیا تھا جن سے معلوم ہوا کہ حکیم اثر ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں بریلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے کیونکہ ان کا مطب چلنا بند ہو گیا تھا اور انہوں نے کئی بار جائے مطب تبدیل کی تھی ممکن ہے کہ نہال سخن دسمبر ۱۹۱۵ء کے بعد نہ چھپا ہو۔

ایک عظیم الشان علمی کارنامہ

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلی جلد جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے، شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔ یہ کتاب $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$ تقطیع کے چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت چالیس روپے

انجمن ترقی اُردو
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

مولانا حامد علی خاں

شیخ عبدالقادر مرحوم

موجودہ صدی کے ابتدائی پچاس سال میں شیخ عبدالقادر مرحوم و مغفور نے اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے اور اسے مدارج ترقی پر پہنچانے کے لئے جو مسلسل اور پیہم اور حاصل جد و جہد کی برعظیم پاکستان و بھارت کے تمام اہل علم اس سے پوری طرح واقف اور اس کے لئے اس بےریا خادم قوم کے دل سے احسان مند ہیں۔ شیخ صاحب نے اس زمانے میں علماء و اکابر قوم کو تحفظ اردو کی طرف متوجہ کیا اور نوجوان کے ولولۂ خدمت ملک و ملت کو ابھارا اور ان کی عملاً حوصلہ افزائی بھی کی جب بہت سے دوسرے رہنماؤں کو بھی ہماری قومی زندگی میں اردو کے صحیح مقام کا احساس بھی نہ ہوا تھا اور وسے حضرت ممدوح کا عشق آخر تک اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر بھی زبان کی خدمت کے بارے میں ان کا جذبہ والہانہ سرد نہ ہو سکا۔ سفر ہو یا حضر، دیس ہو یا پردیس وہ ہر دم اور ہر آن اپنی محبوب زبان کے دمساز رہے جس خصوصیت نے ان کو اردو کا سب سے بڑا محسن بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ صاحب محض ایک بڑے ادیب ہی نہ تھے بلکہ اس سے بڑھ کر ایک بہت بڑے ادیب ساز اور ایک بہت بڑے شاعر گر بھی تھے اس سے زیادہ ادب کا کوئی نقاد کیا شرف حاصل کرے گا کہ جس زمانے میں حکیم الامت، علامہ اقبال، خود اپنی شاعری کی اہمیت سے ناواقف تھے بلکہ شعر گوئی ترک کر دینا چاہتے تھے اور عبدالقادر علیہ الرحمتہ کے نام اس قسم کے شعر لکھ بھیجتے تھے کہ :-

مدیر مخزن کو جا کے اقبال کوئی میرا پیام دیدے!
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اور انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ فی الواقع شعر گوئی ترک کر دینے کے ارادے کا اظہار بھی کیا تو اس زمانے میں بھی اپنی قوم اور اپنی زبان کا یہ سچا شیدائی یعنی نوجوان مگر دور اندیش نقاد عبدالقادر اپنے فاضل اجل فلسفی دوست کے اس پیغام سے مرعوب نہ ہوا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے بتایا کہ خدا نے تمہیں وہ جوہر بخشا ہے کہ اگر تم اس سے کام لوگے تو بہت بڑا کام کرو گے محض اسی وجہ سے جب تک پاکستان باقی ہے یا دنیا کے کسی حصے میں اردو کے شیدائی موجود ہیں حضرت شیخ عبدالقادر کا نام ہماری قومی زبان کی تاریخ میں درخشندہ و تابندہ رہے گا اور یقیناً ان کے نقش قدم جادہ پیمایان منزل ادب کی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہیں گے۔

۱۹۴۸ء کے اواخر میں جب حمید نظامی مرحوم نے شیخ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ادارہ "نوائے وقت" کی طرف سے درخواست کی کہ "مخزن" کے از سر نو اجراء کی اجازت مرحمت فرمائی جائے اور شیخ صاحب رسالے کے سرورق پر اپنا نام نامی لکھنے کی اجازت بھی دیں تو میں بھی ولادت رسوم کے "مخزن"

مجوزہ مدیر کی حیثیت سے نظامی صاحب کے ساتھ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ شیخ صاحب قبلہ نے ہمیں نہایت مسرت سے اجرائے "مخزن" کی اجازت دے دی اور پھر ازراہ ذرہ نوازی فرمایا کہ اگر یہ ہوں کہ تو میرا نام بطور ڈائرکٹر کے نہیں۔ بطور مدیر اعزازی لکھیے"

بعد کی ملاقاتوں میں شیخ صاحب نے رسالے کے متعلق مجھے متعدد گراں بہا مشورے دیے اور "مخزن" کے لئے افتتاحی مضمون بھی عنایت فرمایا جس کا عنوان تھا مخزن کے نئے دور دوم مخزن پر۔

پہلا پرچہ جنوری ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا جن اصحاب کو میں نے شیخ صاحب کی طرف سے تعاون کی دعوت دی تھی انہوں نے بصد مسرت اسے قبول کیا۔ مثال کے طور پر میر غلام بھیک نیرنگ کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جو مجھے اپنے خط کے جواب میں ملا۔ میر صاحب ایک مدت سے لکھنا ترک کر چکے تھے اور شب و روز تبلیغی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ شیخ صاحب کی روحانی کشش انہیں پھر میدان میں کھینچ لائی اور ان کی طرف سے یہ دلکش نظم اور نثر موصول ہوئی۔ میرے خیال میں ان کا یہ خط اردو کے بہترین مکتوبات میں شامل ہونے کے قابل ہے مجھے مخاطب کر کے لکھتے ہیں۔

آپ کا مکتوب مورخہ ۲۸ اکتوبر یکم نومبر کو ملا۔ مضمون کے لحاظ سے اس یاد آوری کا خاص شکریہ۔ نیرنگ کا از کار رفتہ دماغ اور غبارستان جھنگ کا سا ماحول کہ یہاں کے سہ ماہی قیام میں آج تک کوئی عام یا نجی صحبتِ شعر و ادب نہ دیکھی نہ سنی۔ کیسے ممکن تھا کہ حضرت شیخ کے ارشاد کی تعمیل نہ کی جاتی۔ وہ تو جناب شیخ کی جاذبیت اور "مخزن" کے نام کا جادو تھا کہ خط کو پڑھتے ہوئے اشعار آنا شروع ہوئے۔ موسلا دھار بارش نہیں ہوئی آہستہ آہستہ تقاطر ہوا۔ مگر اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ ورنہ عرصہ دراز سے کہہ چکا ہوں ؎

اب تو یوں ہم سے کوئی اہلِ سخن ملتا ہے
جیسے غربت میں کوئی یارِ وطن ملتا ہے

بہرحال یہ "خیر مقدم" حضرت شیخ اور "مخزن" کی نذر ہے

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

یہاں نوا کے وہ معنی سمجھیے جو "نوائے وقت" میں ہیں۔

"میں نے غبارستانِ جھنگ کا ذکر کیا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خطہ رتمان سے خالی نہیں رہا۔ ہیر کا مزار اسی جھنگ میں ہے حضرت سلطان باہو جیسے عارف کا مزار جھنگ سے پچاس میل پر اسی ضلع میں واقع ہے۔ مگر اس وقت تو یہاں کے لوگ ہر قسم کے ذوق سے خالی نظر آتے ہیں اونٹ اور کجاوے کثرت سے دیکھے مگر نہ بستی نظر پڑی نہ بشتن۔

بھینسیں بہتیری مگر جا کے مجھیں دا دیکھا نہیں گیا

میں راولپنڈی میں تو ماہ تک رہا۔ وہاں شعر و ادب کے خوب جمگھٹے دیکھے۔ انجمن ترقی اردو نے ابتدا ہی میں میری عزت افزائی کے طور پر ایک اجتماع کیا۔ اس میں حکام سول و فوج کے علاوہ شعراء کی ایک بڑی تعداد تھی انہوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ مجبوراً مجھ کو کچھ پڑھنا پڑا۔ اس کے علاوہ یوم اقبال کی صحبتیں رہیں۔ مشاعرے ہوئے۔ ایسا ماحول ہو تو گونگا بھی بولنے لگتا ہے۔ خدا کرے "مخزن" اب پھر پہلی سی آب و تاب سے نکلا کرے۔ مخزن آتا رہا تو تعجب نہیں نیرنگ بھی کبھی کبھی اس کے صفحات میں کچھ لکھا کرے۔

میرا تمام کتب خانہ اور تمام مسودات انبالے میں رہ گئے۔ دماغ کو کرید کر بھی میں اس نظم کے دو ڈھائی شعر سے زیادہ نہ نکال سکا جس کی نسبت ختم

شیخ کا ارشاد تھا اُن کی خدمت میں میرا سلامِ شوق عرض کر دیجئے اور معذرت بھی۔ والسلام۔

راقم نیرنگ۔

ہم نشیں یہ کون کہتا تھا کہ مخزن چل بسا؛ — بات یہ تھی ملتوی تھا کچھ دنوں شغلِ سخن
لیجئے حامد علی خاں لکھتے ہیں لاہور سے — منعقد ہونے کو ہے اب پھر وہی بزمِ کہن
پھر وہی سرخیلِ اہلِ ذوق و اربابِ ادب — شیخ عبدالقادر اس کے ہونگے صدرِ انجمن
کھنچ گئے جن کی کشش سے بزمِ "مخزن" کی طرف — چار وانگ ہند سے چوٹی کے اربابِ سخن
خان بہادر بھی ہوئے جج بھی ہوئے سر بھی ہوئے — عمر بھر لیکن رہی اردو کی خدمت کی لگن
اک رسالہ ہی نہیں "مخزن" یہ اک تحریک ہے — آج ہیں جس کے نتائج ہر طرف جلوہ فگن
بیسوں اعلیٰ رسالے جس سے پیدا ہو گئے — سینکڑوں اہلِ قلم اور سینکڑوں نقادِ فن

اب زمانہ ہے کہ اس تحریک کی قوت بڑھے
یعنی عالمگیر ہو اردو کے سکے کا چلن

ہر جگہ اب تو اردو کو اجاڑا جائے گا — بلدہ دہلی ہو یا ہو لکھنؤ یا ہو دکن
ہر طرف سے کر کے ہجرت آئے گی لاہور میں — مغربی پنجاب ہی اب ہوگا اردو کا وطن
وقت پر آئے جناب شیخ پھر میدان میں — ہو مبارک آپ کو اے نکتہ سنجانِ زمن

گلشن مخزن بنے گا پھر جہانِ رنگ و بو
عندلیبانِ سخن پھر ہوں گے اس میں نغمہ زن

افسوس ہے کہ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو شیخ صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اُن کی رحلت کے چند مہینے بعد کچھ ایسے ناسازگار حالات پیدا ہوئے کہ "مخزن" کی اشاعت تیسری مرتبہ پھر ملتوی کر دینی پڑی۔ "ملتوی" کا لفظ میں نے عمداً استعمال کیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ مخزن پھر جاری ہوگا "مخزن" ہمیشہ بند نہیں رہ سکتا۔

بانیِ "مخزن" کی رحلت پر انہی دنوں "مخزن" کا جو پرچہ شائع ہوا، اُس میں، برِعظیم کے طول و عرض سے نغز ہنر کے جو پیغامات ملے تھے، شائع ہوئے دوسرے رسائل و جرائد سے اقتباسات بھی درج کئے گئے تھے۔ کچھ منتخبات کا ذکر شاید یہاں مناسب ہو۔

حفیظ ہوشیارپوری

اُسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں — وہ تھا قلب و دماغِ شہرِ لاہور

تلوک چند محروم از دہلی

افسوس کہ اردو کا نگہباں نہ رہا — شاعر گر و نقادِ سخن داں نہ رہا

بے صدر ہوئی انجمن علم و ادب — یعنی ادب آموز ادیباں نہ رہا

ولہٗ

یکساں دل این و آں کا وہ پیارا شیخ — تہذیب کہن کا پیکر زیبا شیخ
تھا کوئی اگر تو تھا وہ عبدالقادر — شاعر مدح جس کے ہوں ایسا شیخ

امین حزیں سیالکوٹی

اقبال کی یادگار تھے شیخ — اقبال کے یار غار تھے شیخ
"اک بلبل خلد" جس پہ چہکا — لاریب وہ شاخسار تھے شیخ
ملت کا چمن تھا رشک فردوس — اقبال تھے گل، ہزار تھے شیخ
پیرانہ سری میں بھی وہی عشق — اردو پہ دل نثار تھے شیخ

اسی موقع پر علی گڑھ سے آل احمد سرور نے راقم کے نام ایک خط میں لکھا تھا "اس وقت آپ کو خط لکھ رہا ہوں تو بیساختہ میری ایک رباعی یاد آرہی ہے مرحوم پر یہ رباعی صادق آتی ہے۔

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

سرور صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "مخزن" کو شیخ صاحب کی سب سے بڑی یادگار سمجھ کر چلائیے۔" ان کی یہ آرزو آج بھی ہم سب کی آرزو ہے کاش "مخزن" جلد ہی پھر جاری ہو جائے اور اپنے ہر پہلے دور کی طرح اب بھی نئے اور پرانے ادب کا سنگم ثابت ہو۔

(بہ شکریہ کوہستان لاہور)

نصاب اردو (نظم) اردو کے شعری سرمائے کے اس انتخاب میں ایسی منظومات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو ہمارے ادب میں مستقل مقام رکھتی ہیں۔
قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی

پروفیسر شبیر کاظمی

اساسِ اردو

(لکھنؤ روزمرّہ)

(۲)

چندن چوکی پر بیٹھنا ۔ آرام سے بسر کرنا۔ اور یہاں کون چندن چوکی پر بیٹھا ہے۔

چنگ پر چڑھانا ۔ صلاح دینا۔ آمادہ کرنا۔ لوگوں نے چنگ پر چڑھایا کہ حضور جو ہم کہیں وہ کیجیے تو آج کی بلا ٹل جائے۔

چوٹیں خالی دینا ۔ وار بچانا۔ حملہ کو روکنا۔ شکیل نے سب چوٹیں خالی دیں اور سحر پڑھ کر تلوار کا وار کیا۔

چوٹ چلنا ۔ مقابلہ کرنا۔ صبا رفتار شمشیر کھینچ کر آپڑی۔ برق سے چوٹ چلنے لگی۔

چونگا کرنا ۔ فریب اور فطرت کرنا۔ ابھی لڑکپن بہت ہے۔ بچپنا نہیں جاتا۔ ان کو چونگا کرنے اور روپیہ اینٹھنے کی ترکیبیں نہیں یاد ہیں۔

چومکھ لڑنا ۔ ہر طرف سب کو جواب دینا۔ حضرت آپ اس وقت چومکھ لڑ رہے تھے۔ یہ آپ ہی کا کام ہے۔

چونے پر پانی چھڑک دینا : بہت غصہ میں آجانا۔ یہاں آزاد دیکھتے ہی دیکھتے بگڑ گئے اور ایسے گرمائے۔ جیسے چونے پر پانی چھڑک دیا۔

چھ گڈّم ہونا ۔ چھ دوستوں کا ایک جا جمع ہونا۔ ایک شاعر اور آجائے تو چھ گڈّم کی خوب ٹھہرے۔

چھان بنان ہونا : اچھی طرح دریافت کرنا۔ جب تک ایک بات کی خوب چھان بنان نہ ہو تب تک لطف نہیں۔

چھیچھڑے پر چھری چلنا۔ معمولی بات پر لڑائی ہونا۔ آج چک منڈی میں بز قصابوں میں چھیچھڑے پہ چھری چلی۔

چھپر پر رکھنا : بند کر دینا۔ ہٹا دینا۔ ان سے کہہ دو کہ اس شعر خوانی کو چھپر پر رکھیں۔

چھاپ بیٹھنا۔ دبا لینا۔ چھا جانا۔ گھوڑا تو انکے تن و توش سے چھپ جاتا تھا جیسے اچھا خاصا بنڈیلا سور گھوڑے کو چھاپ بیٹھے۔

چھوٹی امت کا ہونا۔ معمولی طبقہ سے تعلق رکھنا۔ ان کی چال ڈھال سے میں تاڑ گئی کہ چھوٹی امت کی ہیں۔

چھک کر کھانا۔ خوب سیر ہو کر کھانا۔ زردے اور میوہ [illegible] تھے۔ جی چاہا خوب چھک کر کھائے۔

چھکے چھوٹ جانا۔ عاجز ہونا۔ آزاد نے بیٹھے ہی وہ داؤں پیچ کیے کہ پہلوان کے چھکے چھوٹ گئے۔

چھٹی کا دودھ یاد آنا۔ بہت عاجز ہونا۔ ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد آیا۔

چہیتے یار بنانا ۔ دوست بنانا ۔ مصاحبین سب کے سب مل کر میاں آزاد کو چہیتے یار بناتے تھے ۔

چیں بول جانا ۔ ہار مان لینا ۔ بٹیر مرغ پر لپک کر لات مارے تو وہ بھی چیں بول جاتے ۔

ح

حواس بیتره ہونا ۔ گھبرا جانا ۔ فوجی نے اس کو ایسا للکارا اور وہ ڈانٹ بتائی کہ اس کے حواس بیتره ہو گئے ۔

حواس مفقود ہونا ۔ خوف زدہ ہونا ۔ قبلہ تلوار کی چمک کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے ایسا سہما کہ ہوش حواس مفقود ہو گئے ۔

خالہ جی کا گھر نہ ہونا ۔ بہت مشکل میں پھنسنا ۔ عاشقی خالہ جی کا گھر نہیں ہے ۔

خار کھانا ۔ ناخوش ہونا ۔ میں بیگم سے خار کھاتا ہوں ۔

خالی از علت نہ ہونا ۔ کسی نہ کسی مصلحت کا ہونا ۔ بھئی بیگ کیلئے جانا خالی از علت نہیں ہے کچھ دال میں کالا کالا ہے ۔

خام پارہ ہونا ۔ نااہل ہونا ۔ ہم سے یارانہ پیدا کرنا چاہتی تھی خام پارہ ۔

خدائی خوار ہونا ۔ ذلیل ، لفنگا ہونا ۔ اماں جان کی بات نہ ٹلے گی اور موا آزاد خدائی خوار ہے ۔

خط گھٹوانا ۔ حجامت بنوانا ۔ پیر بخش کو خط گھٹوانے کا شوق جو چرایا تو حجام کو بلوایا ۔

خفت مٹانا ۔ شرمندگی دور کرنا ۔ اب جو شہزادی سے بس نہ چلا تو اپنی خفت ہم پر مٹائی ۔

خلوئے عہدہ ۔ ملازمت کے لئے جگہ کا خالی ہونا ۔ اور اچھا اہلکار نہ ملا تو حکام خلوئے عہدہ کا حال مشتہر کرتے ہیں ۔

خنجر روز کند ہونا ۔ دن کا ختم ہونا ۔ اس عرصہ میں وہ دن بھی تمام ہوا اور وہ زمانہ آیا کہ شبِ تیرہ نام نے منہ دکھایا خنجر روز کند ہوا ۔

خون جسم کا ہلکا ہونا ۔ نازک بدن نازک خیال ہونا ۔ ابھی نام خدا کنوارا پنڈا ہے خون جسم کا بہت ہلکا ہے ۔

خیز کرنا ۔ تیز کرنا ۔ اتنے دق ہوئے کہ ٹٹو کو انہوں نے خیز کیا ۔

خیمے نصب کرنا ۔ ٹھہر جانا ۔ قیام کرنا ۔ اب یہاں سے چلو تب کوئی بات ہو ۔ تم نے تو یہاں خیمے نصب کر دیئے ۔

د ڈ

دال میں کالا نظر آنا : مشکوک نظر آنا ۔ شبہ معلوم ہونا ۔ کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے ۔

دامن امید گوہر آورند سے مالامال ہونا ۔ مطلب حاصل ہونا ۔ اس حقیر سراپا تقصیر کا دامن امید گوہر آورند سے مالا مال ہو جائے گا ۔

دھتا بتانا ۔۔۔۔۔۔ راستہ سے ہٹا دینا ۔ رئیس نے مارے غصہ کے آزاد کو دھتا بتایا ۔

دھول دھپا مچانا۔۔۔۔ ہنسی مذاق کرنا۔ تیسرے غول بیابانی میں دھول دھپا ہوتا تھا۔

دبے پیر بلی کا چوہے سے کان کٹانا۔ طاقتور کا کمزور سے مجبور ہو جانا۔ آزاد نے چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدلی۔ سچ ہے دبے پیر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔

دبول دبول کر کے عیب چھپانا۔ خاموشی اختیار کر لینا۔ چپ سادھ لینا۔ لوگ کہیں گے کہ نرگسی چشم کہیں کسی کے ساتھ پکڑی گئی۔ ماں نے دبول دبول کر کے عیب چھپایا۔

دبدبے سے ڈرنا۔ خوف کھانا۔ مہ جبیں نے کہا سبحان اللہ کیا کہنے ڈریئے آپ کے دبدبے سے کہ ایسی چاہنے والی پر کچھ رحم نہ کیا۔

دبوں دبوں کرنا۔ عیب کو چھپا دینا۔ ماں نے دبوں دبوں کر کے عیب کو چھپایا۔ مگر بیٹی کو نکلنے نہیں دیتی ہے۔

دست ہوس دراز کرنا۔ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ ملکہ نے ہنس دیا۔ شاہ نے پھر دست ہوس دراز کیا۔

دست برد کرنا۔ قبضہ میں کرنا۔ تاجر مال اٹھوا کر چلا۔ یہ بھی ساتھ ہوا کہ راہ میں اور کچھ دست برد کروں۔

دل میں ہول سمانا۔ خوف زدہ ہونا۔ خالہ جان کیا کہوں۔ دل میں ہول سمایا ہے۔

دل لگی باز ہونا۔ پر مذاق ہونا۔ وہ دل لگی باز آدمی ہیں۔ بس ہمارے تمہارے سوا اور کوئی نہ جاننے پائے۔

دم ٹوٹ جانا۔ تھک جانا۔ بے حال ہو جانا۔ جب سب کا دم ٹوٹ گیا اور لگے ہانپنے تو لگے ہاتھ سے چھوٹ پڑے۔

دم میں نہ آنا۔ دھوکہ نہ کھانا۔ افراسیاب نے یہ تقریر سن کر کہا کہ اس کے فقرے پر اور دم میں نہ آنا۔

دن پھورنا۔ آرام میسر ہونا۔ سو ہمارے تو آج دن پھرے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے۔

دو دو چونچیں ہونا۔ تو تو میں میں ہونا۔ جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہر پناہ کے پاس دونوں میں دو دو چونچیں ہو گئیں۔

دو گال ہنسنا بولنا۔ دل بہلانا۔ رنگین کمروں پر دو گال ہنس بول آئیے۔

دہن بدہن او دست بدست کشتی ہونا۔ دست بدست لڑائی ہونا۔ جنگ آغاز ہوئی۔ دہن بدہن اور دست بدست کشتی بعد درشتی رہی۔

دہان بائیس پنیری لگانا۔ سب کو ایک طرح سمجھنا۔ اور ایک سرے سے سب باجی۔ سب دہاں بائیس پنیری لگا دیئے۔

دھرے اڑانا۔ بھرکس نکالنا۔ سخت سزا دینا۔ اپنے شہزادے کے ساتھ دھرے نہ اڑا۔

ڈھنی دینا۔ ٹھہرنا۔ قیام کرنا۔ سب باتیں بھی ہوں گی ڈھنی بھی دیں گے۔

ڈینگ کی لینا۔ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا۔ ان کے لنگوٹیے یار بیٹے ڈینگ کی لے رہے ہیں۔

راستہ ناپنا۔ چلنا۔ ادھر ادھر چکر لگائے راستہ ناپا اور گر کر سو رہے۔

رام رام کی گولیاں لکھنا۔ تعویز لکھنا۔ جو دنیا ترک کر کے پہاڑوں کی کھوہ میں بیٹھے ہیں۔ یا جو رام رام کی گولیاں دن بھر

لکھا کرتے ہیں۔

رتی زور پر ہونا۔ کامیابی حاصل ہونا ان موئے نمک حراموں کی تو آج کل رتی زور پر ہے۔

ردائے شاہد دہر میلی ہونا۔ شام ہونے کو آئی۔ آخر جب ردائے شاہد دہر میلی ہوئی اور گیروا لباس درویش روزگار نے اتارا۔ خیمہ عالم میں قدم شب مشک فام نے رکھا۔

رقمیں کھانا۔ روپیہ پیسہ حاصل کرنا۔ وہ جنبش دیوانی نواب کے یہاں رقمیں کھا کھا کر تنی بنی پھرتی تھی۔

رقمیں چیرنا۔ خوب روپیہ کمانا۔ ضرور ہے کہ سرکاری رقمیں چیرتے اور دندناتے تھے۔

رکھائی کے ساتھ بولنا۔ بے مروتی کرنا۔ میں جو گئی تو بڑی بہن نے رکھائی کے ساتھ باتیں کیں۔

رنج کا خار دل میں چبھنا۔ رنجیدہ ہونا۔ میں سبز گلزار سے اس وقت عار رکھتا ہوں کہ رنج کا خار دل میں چبھا ہے۔

رنگ بے رنگ نظر آنا۔ حالات کا مناسب نہ ہونا۔ عمرو یہ سنتے ہی کانپنے لگا کہ ابھی اس کا آنا خالی از علت نہیں۔ رنگ بے رنگ نظر آتا ہے۔

رولا لانا۔ نخرہ کرنا۔ ینا۔ جہاز پر فوجی کو سردیا ہی کی خبر نہیں ورنہ وہ رولا لاتے کہ الامان۔

روتے روتے خون کبوتر کی طرح سرخ ہونا۔ بہت زیادہ آنکھوں کا سرخ ہونا۔ باجی کی آنکھیں روتے روتے خون کبوتر کی طرح سرخ ہوگئیں۔

روبفرار لانا۔ بھاگ جانا۔ اور تیغ بکف فوج دشمن میں در آیا۔ فوج روبہ فرار لائی اور بھاگ کر قلعہ کے اندر گئی۔

ریت ڈالنا۔ ذبح کرنا۔ تکلیف پہنچانا۔ مگر میری گردن تو کند چھری سے ریت ڈالی۔

ز

زر دینا، ضامن نہ ہونا۔ روپیہ دے دینا۔ مگر ضمانت نہ کرنا۔ میں کسی کی ضامن واضمن نہیں ہوتی۔ زر دیجیے۔ ضامن نہ ہوجیے۔

زلف چلیپا کی بلائیں لینا۔ زلفوں پر نثار ہونا۔ شیطان در غلاتا تھا کہ جھکی تو زلف چلیپا کی بلائیں لیں۔

زمین کے گز بننا۔ زیادہ گھومنا پھرنا۔ میاں آزاد زمین کے گز بنتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

زنگئ شب کا عالم میں قدم رکھنا۔ شام ہونا۔ عمرو بن امیہ ضمری نے جب وہ زمانہ آیا کہ زنگئ شب نے اس عالم میں قدم رکھا اور روز کا سایہ مغرب میں جا کر آرام پذیر ہوا۔

زور کے آگے ظلم نہ چلنا۔ طاقتور کے سامنے کمزور کا کامیاب نہ ہونا۔ مثل مشہور ہے کہ زور کے آگے ظلم نہیں چلتا۔ مگر عیاروں نے آفت برپا کر دی۔

زہرہ خوف سے آب ہونا۔ بہت ڈر جانا۔ جس کی ہیبت سے برج اسد میں جا کر چھپا اور خنجر گزار سپر کا زہرہ خوف سے آب ہوتا۔

زہرہ آب ہونا۔ گھبرا جانا۔ پریشان ہو جانا۔ بھائی خشکی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے ورنہ سلام۔ پانی کی صورت دیکھی اور زہرہ آب ہو گیا۔

زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑنا۔ گہرے تعلقات میں شکر رنجی پیدا ہونا۔ چلئے اب تعریفیں رہنے دیجئے۔ زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑتے ہیں۔

زبان وا کرنا۔ کہنا۔ ارشاد فرمانا۔ امیر نے بعد خاطر داری زبان گہر ریز کو وا کیا۔

س

ساکھے کی لڑائی ہونا۔ سخت مقابلہ ہونا۔ اول تو عذر کریں گے اور اگر نہ مانا تو دیکھے گا وہ ساکھے کی لڑائی ہوگی اور ایسی تلوار چلے گی کہ حریف کے دانت کھٹے کر دیں گے۔

سات پانچ نہ آنا۔ نطرت اور ہوشیاری۔ بی بی مجھ کمبخت کو تو سات پانچ نہیں آتا۔

ساغر اجل سے سیراب ہونا۔ زندگی کا خاتمہ ہونا۔ مارا جانا۔ اے مجرم جو کھانا ہو وہ کھالے اور پیاسی ہو تو پانی پی لے کہ ساغر اجل سے سیراب ہوا چاہتی ہے۔

سات بار سلام کرنا۔ مان لینا۔ تسلیم کر لینا۔ جب ایسی ہی ساس پاؤگی اور پھر بل جل کے رہوگی تو سات سلام کروں گی۔

سبھ گھڑی یاد کرنا۔ اچھی گھڑی یاد کرنا۔ وہ سبھ گھڑی یاد کرو جب ہم دولہا بنے تھے۔

سبز بخت ہونا۔ خوش نصیب ہونا۔ آج تو میں سرخرو رہا۔ آپ سبز بخت ہیں۔

ستر ہون کرم ہونا۔ بری حالت ہونا۔ جب تک کوئی روکے روکے ستر ہون کرم ہو جائیں۔

ستو باندھ کر پیچھے پڑنا۔ ہمہ تن مصروف ہونا۔ وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے۔

سٹی پٹی بھول جانا۔ گھبرا جانا۔ کپتان کے ہاتھ بھول گئے اور اس کے لفٹیننٹ بھی سب سٹی پٹی بھول گئے۔

سرہنگی کی لینا۔ اونچی اونچی باتیں کرنا۔ اور کبھی سرہنگی کی لیتی ہو کہ معلوم ہو بڑی کراری ہو۔ بڑی پہلوان ہو۔

سر بدر کرنا۔ برآمد ہونا۔ یہ سیاح منازل سپہر دشت طلسم بھی در سے باہر ہوئے اور وہ خاور سے خورشید انور نے سر بدر کیا۔

سر عجز آسمان تفاخر پر پہنچنا۔ عزت پانا۔ آج کی شب یہیں استراحت کریں۔ سر عجز ہمارا آسمان تفاخر پر پہنچائیں۔

سر کو قدم بنا کر حاضر ہونا۔ محبت کے ساتھ آنا۔ بعجلت تمام آنا۔ میں بھی بہت اشتیاق ملاقات رکھتا تھا اسی لئے بادشاہ کے لکھتے سے فوراً سر کو قدم بنا کر حاضر ہوا۔

سر رشتہ عقل ہاتھ سے کھونا۔ ناسمجھی کرنا۔ اس نے دیکھ کر سر رشتہ عقل ہاتھ سے کھویا۔ اور خود رعب میں آکر ملکہ کو مجرا کیا۔

سنیچر پاؤں پر سوار ہونا۔ ہر طرف گھومنا۔ تڑکے خواب خرگوش سے بیدار ہوئے تو پھر سنیچر پاؤں پر سوار ہوگیا۔

سون کھینچنا۔ چپکے پڑے رہنا۔ بیگم سنتی ہو کہ نہیں۔ جگی ہیں۔ مگر سون کھینچے پڑی ہیں۔

سودا لہو ہونا۔ بیقرار ہونا۔ گھبرانا۔ جب سے اسے دیکھا ہے اس کی زلف گرہ گیر میں دل الجھا ہوا ہے۔ سودا لہو ہوگیا ہے۔

سینہ سپر ہو کر لڑنا۔ بڑی جانبازی سے لڑنا۔ ساحران نامی ملازم افراسیاب سینہ سپر کر کے لڑنے لگے۔

ش

شام فنا دکھانا۔ مار ڈالنا۔ صبح شب کو شام فنا دکھائیے گا۔

شپہ لڑنا۔ رسائی حاصل کرنا۔ اس طباچی بچے کی خوش قسمتی کو دیکھو کہاں جا کے شپہ لڑایا۔

شکل میں رونا لگنا۔ رونی صورت ہونا۔ صاحب کیا تیری شکل میں رونا لگا ہے۔ میں روتے آدمی سے گھبراتی ہوں۔

شہ دینا۔ تعریف کرنا۔ خوشامد خورے شہ دے رہے ہیں کہ حضور کا آج تمام لکھنؤ میں نام ہو رہا ہے۔

شیشے میں اتارنا۔ قابو میں کرلینا۔ یار ایسی پری تو کروڑوں روپے بھی ترچنے سے شیشے میں نہیں اتر سکتی۔

ص

صفحہ دل سے حک ہونا۔ بھول جانا۔ کوکب کا خیال کیسا نام تک صفحہ دل سے حک ہوگیا۔

ط

طائر ہوش پرواز کرنا۔ گھبرانا۔ پریشان ہونا۔ یہ کلمات جو شزبر نے سنے طائر ہوش پرواز کر گئے۔

طرح دینا۔ درگزر کرنا۔ اب تک میں نے طرح دی کہ یاغی راہ پر آجائیں۔

طوق محبت درگلو ہونا۔ محبت ہو جانا۔ مالن کے سرو قامت کو دیکھ کر قمری کی طرح طوق محبت درگلو ہوا۔

ع۔غ

عاشق تن ہونا۔ جاں نثار کرنا۔ حضرت آپ تو عاشق تن آدمی ٹھہرے۔

عقل کی دوا کرنا۔ سمجھ داری سے کام لینا۔ ارے عقل کی دوا کر مردوے۔

غائب غلہ رہنا۔ غیر حاضر رہنا۔ بڑی بیگم صاحب اپنے دل میں کہتی ہوں گی کہ دو دن غائب غلہ رہنا چہ معنی دارد۔

غپّا دینا۔ دھوکہ دینا۔ وہ غپا دیا کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتا ہوگا۔
غٹ کے غٹ کو ساتھ لینا۔ زیادہ آدمیوں کو ساتھ لے چلنا۔ حضور اگر میرا کہنا مانیں تو اس غٹ کے غٹ کو ساتھ نہ لے چلیں۔
غلغلہ اقتلو بلند ہونا۔ قتل قتل کا شور بلند ہونا۔ طبل جنگ اور نفیر سحر لشکر روناس میں بجا۔ شور و غلغلہ اقتلو بلند ہوا۔
غلطک مارنا۔ بانک کا ایک داؤں استعمال کرنا۔ الحاصل لڑنا شروع کیا کہ جب غلطک ماری۔ چھ چھ آدمیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔
غین ہونا۔ مدہوش ہونا۔ وہاں لے جاکر اتنی شراب پلا دی کہ فوجی غین ہو گئے۔
غیرت کا پانی پانی ہو کر بہہ جانا۔ بے حیائی اختیار کرنا۔ عمرو نے کہا عشق میں غیرت پانی پانی ہو کر بہہ جاتی ہے۔

ف

فرشتہ خان کو خبر نہ ہونا۔ کسی کو نہ معلوم ہونا۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ چپ چپاتے کل کارروائی کی جائے۔ لوگوں کے فرشتہ خاں کو بھی خبر نہ ہو۔
فرد ہو جانا: بھاگ جانا۔ پاتروں نے ان کا بیگ لیا اور چوٹی اور پیسے لئے اور فرد ہوئیں۔
فقرہ کرنا: دھوکہ دینا۔ جھوٹ بولنا۔ میں نہ کہتی تھی کہ یہ کبھی نہ دے گا۔ فقرہ کرنا ہے۔
فقرے دینا۔ دھوکہ دینا۔ عمرو نے کہا تو بھاگ نہ سکے گی تو فقرے نہ دے گی۔ کہے گی کہ میں مَر مَر ہوں۔

ق

قافیہ تنگ کرنا۔ لاجواب کر دینا۔ اچھا حضور کچھ سوال و جواب ہوں۔ دیکھئے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں۔
قفل دہن زبان سے وا کرنا۔ بات چیت کرنا۔ بادشاہ نے قفل دہن زبان سے وا کیا۔
قلب پھر جانا۔ پریشان رہنا۔ کبیرہ خاطر ہونا۔ مگر عارض کو ہی کا اس حال کے گزرنے سے قلب پھر گیا۔
قدم ڈگ جانا۔ بھاگنا۔ پیٹھ دکھانا۔ تو جوانو لڑ بھڑ کر سرخ رو ہو جس کا قدم ڈگ جائے گا وہ پھر کہیں آبرو نہ پائیگا۔
قدم زن ہونا۔ روانہ ہونا۔ ناچار پھر ایک طرف قدم زن ہوا۔

ک

کاٹے کا من منتر نہ ہونا۔ زیادہ خطرناک ہونا۔ تمہارے تو کاٹے کا من منتر نہیں ہے۔ نواب کے ساتھ اچھا سلوک کیا کانا اور لے دوڑنا۔ عجلت کرنا۔ جلد بازی۔ صاحب برسوں ریاض کیا ہے تب جا کے یہ بات حاصل ہوئی ہے۔ دل لگی نہیں کہ کانا اور لے دوڑا۔

کانٹے بونا ۔ مشکلات پیدا کرنا ۔ یہ کس موئے نٹ کھٹ نے کانٹے بوئے ہیں ۔
کافر نگاہ ہونا ۔ گھورنے والی نگاہ ۔ اندازہ لگانے والی نگاہ ۔ مردوں کی نگاہ بڑی کافر نگاہ ہوتی ہے ۔
کائی لگنا ؛ بہت عرصہ لگ جانا ۔ پرانا ہونا ۔ دیر تک رکنا ۔ جب تک کائی نہ لگ لے گی اُٹھنے کا نام نہ لیں گے ۔
کالا پانی پینا ۔ شراب پینا ۔ امی جان کیا ہم مسلمان لوگ بھی کالا پانی پیتے ہیں ۔
کُتّوں سے آٹا سنوانا ۔ کام کا سرانجام نہ ہونا ۔ آپ تو کتّوں سے آٹا سنواتے ہیں ۔
کر ہونا ۔ بہرہ ہونا جس کی صدائے گوشِ فلک کر ہوا اور شہزادہ ملک قاسم مرکب چمکاتا ہوا ظاہر ہوا ۔
کٹورہ کھنکنا ۔ ہر طرف جشن منایا جانا ۔ عمرو نے اندر شہر کے آکر دیکھا کٹورہ کھنک رہا ہے ۔ گرم بازاری ہر طرف ہے ۔
کٹ مرنا ۔ بیقرار ہونا ۔ تڑپنا ۔ (پریشان ہونا ۔ شرمندہ ہونا) ۔ بدن میں سکت نہیں تو پھر کے ٹکیوں مرتے ہو ۔
کچا کھا جانا ۔ ختم کر دینا ۔ لیکن خبردار کسی سے کہنا نہیں ۔ ورنہ یہ لاشیں کچّا ہی کھا جائیں گی ۔
کچومر نکلنا ۔ بہت زیادہ پٹنا ۔ الغرض بعد خرابی بصرہ میاں خوجی کی جان بچائی ۔ مگر کب ۔ جب کچومر نکل گیا ۔
کچا پڑنا ۔ شرمندہ ہونا ۔ نادم ہونا ۔ ملکہ یہ کلام سن کر کچی پڑی ۔
کچا چٹھا کہہ سنانا ۔ صاف صاف حال بتا دینا ۔ روپیہ کی طمع میں کچا چٹھا کہہ سنایا ۔
کچے گھڑے کی چڑھنا ۔ نشہ سے مدہوش ہو جانا ۔ مگر ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی ۔
کرکری ہونا ۔ ذلت اٹھانا ۔ رسوا ہونا ۔ آپ کے پاس میں چھوٹی بنی ۔ میری بڑی کرکری ہوئی ۔
کڑے خان سے پالا پڑنا ۔ طاقتور سے سامنا ہونا ۔ خلیفہ بے چارے پر ساری چوٹیں صرف کر دیں ۔ کبھی کسی کڑے خاں سے بھی پالا پڑا ہے ۔
کلیجے پر سانپ لوٹنا ۔ ناگوار معلوم ہونا ۔ بالیدگی ہوتی ہے کہ سانپ کلیجہ پر لوٹ رہے ہیں ۔
کلیجہ دراز ہونا ۔ لڑاکا ۔ زبان دراز ہونا ۔ بڑی کلہ دراز عورت ہے ۔
کلیجہ پیپ کر دینا ۔ رنج پہنچانا ۔ یہ خوشی کا کون موقع ہے ۔ بہن تم نے تو کلیجہ پیپ کر دیا ۔
کمیت قلم کو میدانِ قرطاس میں جولاں کرنا ۔ قلم سے کاغذ پر لکھنا ۔ نوجوانانِ تہور شعاران جلالت آثار ۔ کمیت قلم کو میدان قرطاس میں یوں جولاں کرتے ہیں ۔
کمان کے تیر کی طرح چل کھڑا ہونا ۔ بہت تیزی سے روانہ ہونا ۔ میاں آزاد کڑی کمان کے تیر کی طرح چل کھڑے ہوئے ۔
کمروں کو تاکتے رہنا ۔ طوائفوں کے کوٹھوں کو دیکھنا ۔ فرنگی محل کی طرف سے بھی نکلے تو کمروں کو ہی تاکتے رہے ۔
کندے تول کے رہ جانا ۔ لڑائی کے لئے آمادہ ہونا ۔ وہاں کوئی جنگ ہوئی یا ابھی روسی کندے ہی تول کر رہ جاتے ہیں ۔
کور دبنا ۔ کمزور پڑنا ۔ خوف زدہ ہونا ۔ اچھے اچھے بانکوں کی کور دبنے لگی ۔

کوڑیوں کے مول خریدنا۔ معمولی داموں میں لینا۔ میاں روشن علی نے سوا چار سو کی جوڑی خریدی اور اسی وقت نواب صاحب کو لے جا کر دکھائی اور کہا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔

کوڑی گنا بیچنے پھرنا۔ بہت معمولی اور کم قیمت کی دوکانداری کرنا۔ میاں کل تک کوڑی گنا بیچتے پھرتے تھے۔ آج باتیں بناتے ہو۔

کوڑیوں کا نلوہ بچنا۔ کوڑیوں کا محفوظ رہنا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں نلوہ بچ نکلیں۔

کھاٹ کٹنا۔ غرض مند ہونا۔ لو صاحب بھلا ایسی میری کیا کھاٹ کٹتی تھی جو اس سے اشارہ کرتی۔

کھٹیا سمیت دفان ہونا۔ معہ چارپائی کے غائب ہونا۔ آپ جائیں بلکہ کھٹیا سمیت دفان ہوں۔

کھانگتے کھونگتے آنا۔ کھانستے ہوئے آنا۔ ایک پیر مرد لٹھیا ٹیکتے کھانگتے کھونگتے آن کھڑے ہوئے۔

کھچڑی پکنا۔ بک بک کرنا۔ اچھی کھچڑی پک رہی ہے۔

کس کھیت کی مولی ہونا۔ کم حقیقت ہونا۔ اجی آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔ ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہوتے ہیں

گ

گاڑی کا کھل جانا۔ ریل کا چھوٹنا۔ کانسٹیبل نے غل مچایا۔ ہاں۔ ہاں گاڑی کھل گئی الگ رہو۔

گاڑھے وقت آڑے آنا۔ مصیبت کے وقت کام آنا۔ وہ تو کہیے حضور کی نیک نیتی اس گاڑھے وقت آڑے آئی۔

گاج پڑنا۔ مصیبت آنا۔ تکلیف میں مبتلا ہونا۔ تم خود ہی انصاف کرو کہ تمہارے بڑبس سے مجھ پر کیا گاج پڑی۔

گدے لگانا۔ خیالی پلاؤ پکانا۔ ہم خدا جانے پہاڑوں کی نسبت کیا کیا سوچتے تھے۔ گدے لگاتے تھے بس۔

گرو گھنٹال ہونا۔ استاد ہونا۔ ہاں یوں کہیے کہ بے فکرے بہت ہیں اور ان سب کے گرو گھنٹال وہ ذات شریف آپ ہیں۔

گزی کی لنگوٹی لگانا۔ بہت معمولی کپڑا پہننا۔ لاکھوں روپیہ کھا جاؤ! مگر گزی کی لنگوٹی لگائے ہوئے ہو۔

گلچھرے اڑانا۔ مزے کرنا۔ عیش و عشرت میں رہنا۔ کل کا مزدوری کرنے والا شمیم لاٹری نکل آنے سے گلچھرے اڑا رہا ہے۔

گولا افسوں پڑھنا۔ جادو کرنا۔ ایک گولا افسوں پڑھ کر ایسا مارا کہ شکیل کے گرد دھواں ہو گیا۔

گاؤزوریاں کرنا۔ طاقت دکھانا۔ زبان درازی کرنا۔ میاں خوجی پہلے تو بہت ہی جھلائے اور لگے گاؤزوریاں کرنے۔

گوئیاں بنانا۔ سہیلیاں بنانا۔ ایک نصیحت بزرگان یاد رکھو کہ آس پاس کی چھوکریوں کو گوئیاں نہ بنانا۔

گوش فلک کر ہونا۔ شور و غل کے باعث کچھ نہ سنائی دینا۔ نقاروں کی آواز سے گوش فلک کر ہوا۔

گھڑی میں بھوت گھڑی میں اولیا ہونا: غیر مستقل مزاج ہونا۔ تبرے قول و فعل کا اعتبار کیا۔ گھڑی میں بھوت گھڑی میں اولیا۔

گھی کے چراغ روشن کرنا۔ بہت زیادہ خوش ہونا۔ مراد بر آنا ۔ اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔ گھی کے چراغ مسجد میں روشن کروں۔

گھڑی کا کھٹکا ہونا۔ ہر وقت گردن ہلانا۔ آزادی کی باچھیں کھلی جاتی ہیں اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی۔

گہری چھننا۔ زیادہ دوستی ہونا۔ خدا نے چاہا تو گہری چھنے۔ آج پو بارہ ہیں۔

گھانسے رہنا۔ گھیرے رہنا۔ چور چور ارے میاں کہاں۔ کدھر۔ کس رخ۔ لینا۔ پکڑ لیا ہے۔ دیکھو گھانسے رہنا۔

گہار لڑنا۔ لڑائی لڑنا۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں میں گہار لڑتے تھے۔

ل

لادے لادے پھرنا۔ ساتھ رکھنا۔ برس بھر کے لئے انیم ایں جانب کو دیجئے میں اپنے لادے لادے پھروں گا۔

لٹو ہو جانا۔ فدا ہو جانا۔ آخر حسن آرا میں کیا بات ہے جو آپ لٹو ہو رہے ہیں۔

لڑکوری ہونا۔ بچہ والی ہونا۔ اتنا نہ سمجھے کہ ابھی میں آپ بچہ ہوں۔ لڑکوری کیونکر ہو سکتی ہو بھلا۔

لسان ہونا۔ باتونی ہونا۔ میاں آزاد سمجھ گئے کہ یہ کوئی بڑے لسان آدمی ہیں۔

لطف و مدارات کرنا۔ خاطر مدارات کرنا۔ تعلقات رکھنا۔ مجھے کیا۔ چاہے کوئی کسی پر عاشق ہو یا اسکا دشمن بنے۔ مگر میرے دشمنوں سے لطف و مدارات نہ کرے۔

لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا۔ غربت میں بھی مزے لوٹنا۔ ہم نے تو گھر پھونک تماشا دیکھا۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلا۔

لمبے ہونے کا طور سوچنا۔ بھاگنے کی تجویز سوچنا۔ نامرد لمبے ہونے کا طور سوچتے۔

لوکا لگانا۔ آگ لگا دینا۔ موئے غارتی نے کیا دل لگی نکالی ہے۔ اتنا نی بناتا ہے۔ تیرے استاد کو لوکا لگاؤں۔

لوٹ ہو جانا۔ محبت کرنا۔ فدا ہونا۔ اندھا نہ ہوتا تو کلوٹی پر کاہے کو لوٹ ہو جاتا۔

لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنا۔ ہنستے ہنستے بے قرار ہونا۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ سناؤں تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنے لگو۔

لہو مل کر شہیدوں میں داخل ہونا۔ فرضی طریقہ سے کسی گروہ میں مل جانا۔ چلئے۔ بندہ بھی لہو مل کر شہیدوں میں داخل ہو جائے۔

م

ماندی ہونا۔ بیمار پڑ جانا۔ روح افزا سنا تھا کچھ ماندی تھی۔ دبلی ہو گئی۔

مار کھٹے جانا۔ نقصان اٹھانا۔ الو آئی گئی ہمارے مار کھٹے گئی۔

ماچا توڑ بیٹھنا۔ بیٹھ کر اٹھنے کا نام نہ لینا۔ ماچا توڑ ایسے کہ بیٹھے تو بس جم گئے۔

مت بھنگ ہونا۔ چکرا جانا۔ دماغ کا صحیح طور پر کام نہ دینا۔ کہتے تھے مردک سے کہ ہم کو نہ بلانا۔ نہ مانا۔ دیکھ بھنگ سے کیسی مت بھنگ ہوئی۔

مثل باد فنا اڑنا۔ ختم کر دینا۔ تباہ و برباد کر دینا۔ ساحروں کی خاک ہستی دم تیغ سے مثل باد فنا اڑا دی۔

محبت پھوٹ پڑنا۔ بہت زیادہ چاہنا۔ سپہر آرا روز طعنے دیتی ہے کہ ایسی ہی محبت پھوٹ پڑی تھی تو بھیجا کیوں۔

مسکوٹ کرنا۔ صلاح مشورہ کرنا۔ دو ایک دل لگی بازوں نے مسکوٹ کی کہ خوجی کو چھیڑنا چاہئے۔

میٹھے بولنا۔ صاف بات نہ کہنا۔ ہاں کیوں نہیں۔ کیا میٹھے بولتے ہیں۔ جیتا ہیں۔ بھوانتے ہیں۔

منکنا۔ جنبش کرنا۔ ہو کا عالم۔ جانور نہ آدم کتنے تک دبکے پڑے ہیں۔ کوئی منکتا نہیں۔

منہ میں گھی شکر ہونا۔ دعا دینا۔ آپکے منہ میں گھی شکر۔ آپ نے خدا لگتی بات کہی۔

منہ کی کھانا۔ نیچا دیکھنا۔ اس جانب برق دم ہیں جو سامنے آیا نیچا دکھایا۔ جو منہ چڑھا منہ کی کھائی۔

منہ سے انگارے برسنا۔ سخت سست کہنا۔ ان دونوں کے منہ سے تو انگارے برستے ہیں۔

منہ آنا۔ زبان درازی کرنا۔ اب تم منہ آتے ہو۔ کسی دن گردن ناپوں گا۔

منزل کھوٹی ہونا۔ وقت پر نہ پہنچنا۔ تمہاری باتوں میں پھنس کر رہ گیا اور میری منزل کھوٹی ہو گئی۔

منہ سے بولنا نہ سر سے کھیلنا۔ خاموش ہو جانا۔ چپ سادھ لینا۔ وہ کالی ناگن تھی جسکے کاٹے کا منتر نہیں جس کا کاٹا منہ سے نہ بولے نہ سر سے کھیلے۔

منہ پر ہوائی اڑنا۔ گھبرا جانا۔ پریشان ہونا۔ جراروں کے چہروں پر سرخی چھائی تھی۔ نامردوں کے منہ پر ہوائی تھی۔

مو بمو کہہ دینا۔ صاف صاف منہ کے سامنے کہنا۔ سب حال صاف صاف مو بمو کہہ دیا کہ نواب نے بھیجا ہے۔

موس لے جانا۔ لوٹ لینا۔ وہ تو خیر گزری کہ صندوق ہاتھ سے گر پڑا نہیں تو سب موس لے جاتا۔

مہا منہ مچانا۔ آفت برپا کرنا۔ چھوٹی بیگم مہا منہ مچا رہی ہیں۔ اس بڈھے خبیث کو کھڑے کھڑے شہر بدر کر دو۔

میزان نہ پٹنا۔ موافقت نہ ہونا۔ کبھی روٹھ جاتے کبھی گدگداتے۔ غرض کسی طرح میزان نہ پٹتی تھی۔

مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑکنا۔ بے حد بے چین و پریشان ہونا۔ ان کے سر پر تڑتڑ پڑیں پھر پھر دیکھئے جیسے مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑک دیا۔

ن

ناکوں دم کرنا۔ بہت زیادہ پریشان کرنا۔ اتی فردیاں بھوکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا۔

ناک ناک بدنا ۔ ہار جانا ۔ جبھی جو ابھی موقوف نہ کر دیں تو ہاتھ کٹاتا ہوں، ناک ناک بدنا ہوں ۔
ناک پر مکھی بیٹھنا ۔ برداشت نہ کرنا ۔ ایسی تنک مزاج دیکھی نہ سنی ۔ مجال کیا کہ ناک پر مکھی تو بیٹھ جائے ۔
نہتوں میں تیر چلانا ۔ عاجز کر دینا ۔ عمرو کا یہاں سے چھڑانا کیسا ۔ وہ تو آسمان پر سے لے جا سکتے ہیں ۔ ایسے ہیں کہ نہتوں میں تیر چلاتے ہیں ۔
نرے چونچ ہونا ۔ بے وقوف ہونا ۔ آپ بھی واللہ نرے چونچ ہی رہے ۔
نرا گاؤدی ہونا ۔ بالکل کم عقل ہونا ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ واللہ نرا گاؤدی رہا ۔
نشہ کی جھانج ہونا ۔ نشہ کا زور ہونا ۔ اور کہیں نشہ کی جھانج ہوئی تو گھول کر پی جاتا ۔
نصیب آزمائی کرنا ۔ مقابلہ کرنا ۔ کل ہم تم پھر نصیب آزمائی کریں گے ۔
نکھٹو کے کھونٹے میں باندھنا ۔ نااہل کے ساتھ شادی کرنا میرے ماں باپ نے اس نکھٹو کے کھونٹے میں باندھ دیا ۔
نوحہ وشیون برپا کرنا ۔ رونا پیٹنا ۔ جس وقت اسے معلوم ہوا کہ میرا فرزند مارا گیا ۔ عجیب طرح کا نوحہ وشیون برپا کیا ۔
نیارئیے ہونا ۔ چالاک ہوشیار ہونا ۔ میاں صاحبزادے ہم تو دنیا بھر کے نیارئیے ہیں ۔ یہیں کوئی کیسا رنگ پر لائے گی ۔

ہ

ہالا ڈولا آنا ۔ زلزلہ آنا ۔ اللہ جانتا ہے میں تو سمجھی کہ ہالا ڈولا آگیا ۔
ہتھیلی پر سرسوں جمانا ۔ بہت جلدی کرنا ۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا لمبا سفر فوراً ختم کر کے واپس ہو سکوں ۔ کیا ہتھیلی پر سرسوں جما لوں ۔
ہپّنے مارنا ۔ جلد جلد کھانا ۔ ہپّنے مارے اور سیر ہو گئی ۔ کئی سیر کھانا کھایا ۔
ہپّنے سے اکھڑنا ۔ ناخوش ہو جانا ۔ تو یہ کہئے ۔ ہپّنے پر سے اکھڑ گیا ۔
ہپّنے ہی پر ٹوکے جانا ۔ زیادہ نہ کہنے پانا ۔ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ہپّنے پر ٹوک دیئے گئے ۔
ہر دیگچی چمچا ہونا ۔ ہرجائی ہونا ۔ ہر آدمی کے استعمال میں لانا ۔ جیسے خود ہر دیگچی چمچے ہو ایسے ہی سب کو سمجھتے ہو ۔
ہر ڈنگا بیگی ہونا ۔ پھوہڑ ۔ نکمی ہونا ۔ اس مہری نگوڑی کو تو دیکھو ۔ کیسی ہر ڈنگا بیگی ہے ۔
ہڑدنگی دیو کی بچی ہونا ۔ بے ہنر اور موٹی ہونا ۔ بھلا میں اس ہڑدنگی دیو کی بچی کلوٹی ڈائن کے ساتھ بیاہ کرتا ۔
ہڑ ہونا ۔ بھاگ جانا ۔ تلوار کا چمکنا تھا کہ سب ساتھی رفیق نام کے بانکے ہڑ ہو گئے ۔
ہلڑی ہونا ۔ شور مچانے والا ۔ ہاں ہلڑی نہ ہو ورنہ اجیرن ہو جائے گی ۔

ہنگامہ انبساط گرم ہونا۔ ناچ رنگ کی محفل قائم ہونا۔ ناچ ہو رہا تھا۔ ہنگامہ انبساط گرم تھا۔

ہنڈیاں پکنا۔ باتیں کرنا۔ صلاح مشورہ کرنا۔ کمیدان نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو باہم ہنڈیاں پکنے لگیں۔

ہنڈیا چڑھنا۔ مطلب بر آنا۔ حکیم صاحب نے کہا ہم تو ایسا شہر چاہتے ہیں جہاں جینے کا گھر ہو۔ بُخار پیچھا نہ چھوڑتا ہو۔ حبیب اللہ ہماری ہنڈیا چڑھے۔

ہوائی دیدہ ہونا۔ ڈھیٹ ہونا۔ آزادی پسند ہونا۔ خطاب کیا کہ اُف وہ چھوکری تو اب ہوائی دیدہ ہوئی ہے۔

ہوش کی دوا کرنا۔ سمجھ سے کام لینا۔ میں نے کہا ہوش کی دوا کر دلالہ جی۔ مجھ کو اب چھیڑو گے تو سو گالیاں دونگی۔

ہوش بیترا ہو جانا۔ گھبرا جانا۔ گھبرائیے نہیں آپ کے تو ہوش ہی بیترا ہوئے جاتے ہیں۔

ہوا بندھنا۔ شہرت ہونا۔ اس جوار میں کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ دھاک ہے۔ محلہ محلہ ہوا بندھی ہے۔

ہولا خبطہ ہونا۔ بے وقوف کم عقل ہونا۔ نظر قہر آلود ڈال کر کہا۔ ابے او ہولا خبطہ۔ اتار ٹوپی۔ بدل جوتا۔

ہوا سے مینڈھے اچھلنا۔ بہت تیز ہوا کا چلنا۔ طوفان آنا۔ ہوا سے مینڈھے اچھل رہے تھے۔ دریا نوجوانوں کے مزاج کی طرح بلیوں پر تھا۔

ہیاؤ نہ پڑنا۔ ہمت نہ پڑنا۔ بیسواؤں کی طرح بنتے ٹھنتے کا ہیاؤ نہیں پڑتا تھا۔

اُردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ :- بابائے اردو

اُردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے بابائے اُردو مرحوم نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے جو کام کیا ہے اس سے اہل علم بخوبی متعارف ہیں۔ یہ کتابچہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اُردو زبان میں علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی پوری تاریخ بیان کی گئی ہے۔

اس کتابچے کو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت: پچاس پیسے

سیر افلاک :- مرزا محمد رشید

اس کتاب میں چاند سورج اور ستاروں کا حال ایسی سادہ اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے کہ عام اشخاص کو بھی مطالب کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہوگی۔ کتاب میں جا بجا نقشے اور تصویریں بھی ہیں آخر میں کئی مفید فہرستیں اور ضمیمے بھی لگائے گئے ہیں۔

قیمت: ۴ روپے ۷۵ پیسے

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اردو روڈ کراچی

مطبوعات انجمن

تاریخ وسیاست :-

کابل و یاغستان	مولوی محمد علی قصوری	۲۵-۲ روپے
تذکرہ اہل دہلی	سرسید احمد خان مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی	۵۰-۵ ″
جغرافیۂ قرآن	مفتی انتظام اللہ	۵۰-۱ ″
تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو	ہاشمی فرید آبادی	۵۰-۳ ″
داس کیپٹال (جلد اول)	مارکس۔ مترجم سید محمد تقی	۵۰-۷ ″
جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے	امیر شکیب ارسلان۔ مترجم نجم الدین شکیب	۵۰-۴ ″

سلسلۂ اصطلاحات :-

فرہنگ اصطلاحات بنکاری		۵۰-۴ ″
″ ″ فلکیات		۵۰-۱ ″
″ ″ کیمیا		۲۵-۲ ″
″ ″ جغرافیہ		۰۰-۱ ″
اُردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ	بابائے اُردو	۵۰-

سائنس :-

اردو بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس	بابائے اُردو	۰۰-۱ ″
اضافیت	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۰۰-۳ ″
طبیعیات کی داستان	پروفیسر نصیر احمد عثمانی	۷۵-۸ ″
قوائے طبیعیہ	ڈاکٹر صادق حسین	۲۵-۲ ″
جدید معلومات سائنس	میجر آفتاب حسن	۵۰-۷ ″
جراثیمیات	محمد احمد حامی	۰۰-۲ ″
حیوانیات	پروفیسر محشر عابدی	۲۵-۲ ″
نباتی دباغت	سید امداد علی	۵۰-۵ ″
سیر افلاک	مرزا محمد رشید	۵۰-۳ ″

گرد و پیش

تصویر کا پہلا رُخ

ناطقہ سر بگریباں ہے ۔۔۔۔!

ڈھاکہ ۱۱ مارچ۔ ڈاکٹر ظل الرحمن صدیقی نے ٹیچرس ٹریننگ کالج ڈھاکہ کے ایک سیمنار میں مقالہ پڑھتے ہوئے انگریزی کو ثانوی مدارج تک ذریعۂ تعلیم برقرار رکھنے کی سفارش کی ہے اور کہا ہے کہ انگریزی تعلیم محض کلرکوں کی فوج ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ متوسط طبقے پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دیتی ہے انھوں نے کہا کہ اپنے آپ پر انگریزی کی راہ مسدود کرلینا قوم کے لیئے تو نقصان رساں ہوگا ہی لیکن ساتھ ہی ہمارے نظریات کی ہمہ گیری بھی مجروح ہوگی اس کے ساتھ ہی آپ نے لوگوں کو یہ زرین مشورہ دیا کہ انگریزی جیسے نزاعی مسئلے پر جذباتی نہ بنیں۔ پروفیسر عبدالحی نے بھی ڈاکٹر صدیقی کے ان غیر قومی نظریات کی پر زور تائید کی۔ سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے ان فرسودہ نظریات کی کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ ہم انگریزی کو اس کی تمام نوآبادیاتی اثرات کے ساتھ رائج رکھ کر اپنا قومی وقار مجروح کر رہے ہیں بلکہ انگریزی ہماری قومی روایات کے فروغ میں بھی رکاوٹ بن رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے قومی زبان کو زندگی کے تمام شعبوں میں رائج کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں سندھی پنجابی اور پشتو کے فروغ کا کام کرنا چاہیے۔

لاہور۔ مغربی پاکستان اردو اکاڈمی کی مجلس تعلیم کے ایک اجلاس میں اس بات پر اظہار تشویش کیا گیا ہے کہ اب تک منظور شدہ سرکاری امداد ادارے کو نہیں ملی جس کی وجہ سے اکاڈمی کے کئی خریدی منصوبے ملتوی ہوگئے ہیں اور ملازمین کو برطرفی کے نوٹس بھی دے دیئے گئے ہیں اس اجلاس نے جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ فرمارہے تھے صوبائی گورنر اور وزیر تعلیم سے اپیل کی ہے کہ وہ اس سال کے بجٹ میں اکاڈمی کے لیئے مختص شدہ سرکاری امدادی رقم کی ادائیگی کا جلد از جلد حکم دیں۔ ایک قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ملک میں سائنس کو مقبول بنانے اور اردو تعلیم کو فروغ دینے میں اکاڈمی نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس قرارداد میں مزید کہا گیا ہے کہ اگر قومی زبان اردو ذریعۂ تعلیم اور سرکاری زبان نہ ہوگی تو ملک میں سائنسی، تعلیمی اور انفرادی ترقی ممکن نہیں۔ اجلاس میں موجود تمام اراکین نے اس بات کا تہیہ کیا کہ وہ اس ادارے کو ہر قیمت پر زندہ رکھیں گے۔

ڈھاکہ:- مرکزی حکومت نے ماہرین تعلیم اور علماء پر مشتمل پھر ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جو ہر بار کی طرح پھر اس بات کا جائزہ لے گی کہ اعلیٰ سطح پر قومی زبان کو کس طرح بلا تاخیر ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے۔ صوبائی وزیر تعلیم جناب امجد حسین نے بتایا ہے کہ حکومت کو تمام سطحوں پر ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت کا پورا احساس ہے اور اس ضمن میں اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس قسم کی یقین دہانیوں کا اعادہ ہر ماہ حکومت کی طرف سے پابندی سے کیا جا رہا ہے اور کئی سال سے یہ یقین دہانی اپنے تمام دعووں کے باوجود یقین دہانی کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔

دوسرا رُخ

آزاد کشمیر میں اُردو

مظفر آباد: ۴ مارچ۔ آزاد کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے دفاتر میں رائج کرنے کے سوال پر حکومت غور و خوض کر رہی ہے اس سلسلے میں ایک سرکاری ترجمان نے بتایا ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دینے کے سلسلے میں مالی اخراجات کا جائزہ لے رہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں اُردو

قومی اسمبلی کے سابق ڈپٹی سپیکر جناب فضل القادر چودھری نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اور بنگلہ کو بحیثیت قومی زبان کے مساوی درجہ دیا جائے اور ان دونوں زبانوں کو مشرقی پاکستان میں ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ جناب فضل القادر چودھری نے مولانا راغب احسن کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے بعض اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں ہیں۔ اس لیے انھیں توقع ہے کہ حکومت اسکولوں میں دونوں زبانوں کی تعلیم کے لیے مناسب انتظام کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر کسی قومی زبان کی تعلیم کے لیے مناسب انتظام نہیں کیا جاتا تو یہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

کیتھولک تنظیم المصنفین

کیتھولک تنظیم المصنفین پاکستان کی پانچویں سالگرہ کراچی میں منعقد ہوئی جس میں ملک کے استحکام اور اردو زبان کی خدمت کا عہد تازہ کیا گیا۔ اس تنظیم کا قیام ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا تھا اور اس کا مقصد اردو زبان کا فروغ ہے۔ تنظیم کی جانب سے مختلف موقعوں پر ادبی محفلیں اور تقاریب منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

قومی وحدت کی اساس

لاہور ۲۳ فروری۔ چیف اسکاؤٹ کمشنر پاکستان جناب این ایم خان نے کہا ہے کہ مغربی پاکستان میں رہنے والے بنگلہ اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے اردو سیکھیں تو اس سے دونوں صوبوں کے درمیان محبت کے رشتے استوار ہوں گے۔ اور اسی طرح قومی وحدت و اتحاد کو لازوال فروغ حاصل ہوگا۔ جناب این ایم خان نے کہا کہ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ دونوں صوبوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔

علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی خبریں

قائد اعظم کی یادگار کتابیں

کراچی ۲۸ فروری بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کی جائے پیدائش وزیر مینشن کے لائبریری ہال میں ایک سادہ تقریب میں مرکزی وزیر تعلیم جناب قاضی انوار الحق کو قائد اعظم کی ۷۸۵ قانونی کتابوں کا تحفہ استقبالیہ کمیٹی اینڈ

قرنیچ نامی برطانوی ادارے کے صدر جناب الیف۔ ایم ریوبینس نے پیش کیا۔ قائد اعظم نے یہ کتابیں ۱۹۴۸ء میں فروخت کر دی تھیں۔ ان میں سے بعض کتابوں پر قائد اعظم کے دستخط ثبت ہیں۔ اس تقریب میں وزیر تعلیم نے فرمایا کہ یہ قانونی کتابیں قائد اعظم کی دوسری چیزوں کے ساتھ ہمیشہ ہماری یادوں کو منور رکھیں گی۔ اور توانائی کا سرچشمہ ہوں گی۔ وزیر تعلیم نے مسٹر ہالینڈ کلائن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ قائد اعظم کی اس یادگار کو ہمیشہ محفوظ رکھا جائے گا۔

ملک بھر میں واحد نصاب

راولپنڈی ۲۳ فروری۔ گورنر کانفرنس میں جس کی صدارت صدر پاکستان محمد ایوب خاں نے کی، فیصلہ کیا گیا ہے کہ ملک بھر میں واحد نصاب تعلیم رائج کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے فہرست مضامین اور نصاب کا ایک قومی بورڈ قائم کیا جائے گا جو پرانے نصاب پر نظر ثانی کر کے اسے جدید تقاضوں کے مطابق بنائے گا۔ کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ فنون کے تمام مضامین کی کتابیں ماہرین کا ایک خاص گروپ تیار کرے گا اور نچلے درجوں کے لئے ڈگری کی کتابوں کو آسان اردو زبان میں پیش کیا جائے گا۔ ترجمان نے بتایا ہے کہ صدر پاکستان نے یہ ہدایت کی ہے کہ بعض کتابیں ۱۹۶۸ء تک تیار کر لی جائیں۔

امریکہ میں کشمیری زبان

نیویارک ۲۳ فروری۔ امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار الینوس یونیورسٹی میں کشمیری زبان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ ماہرین کے خیال میں یہ پہلا موقع ہے کہ ساری دنیا میں سرکاری طور پر اس زبان کی تعلیم کا انتظام کسی یونیورسٹی میں کیا گیا ہو۔ اس طرح جنوب مشرقی پروگرام کے تحت اردو بنگالی اور فارسی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ کشمیری زبان کی تعلیم کا آغاز اسی سال اگست کے آخر تک کر دیا جائے گا

ایران میں اردو مشاعرہ

تہران ۱۳ فروری۔ حافظ و خیام کے دیس میں اردو کا ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت کونسلر مہدی مسعود نے کی پروفیسر ادریس صاحب صدیقی نے اس موقع پر فرمایا کہ ایران کی ادب پرور و رومان خیز سرزمین پر اردو کا یہ مشاعرہ ایک نیک فال ہے اور اس کے تابناک مستقبل کی طرف ایک واضح قدم ہے۔

نعیم صدیقی کے دو مجموعے

مشہور شاعر و ادیب اور ماہنامہ "سیارہ" لاہور کے مدیر جناب نعیم صدیقی کے دو شعری مجموعے عنقریب شائع ہو رہے ہیں "خون آہنگ" نعیم صدیقی کے رجزیہ کلام کا مجموعہ ہے جس کی تقریظ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھی ہے۔ اس کو مکتبہ کارواں جلد پیش کر رہا ہے "پھر ایک کارواں لٹا" دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں ولولہ انگیز نظموں کا انتخاب شامل ہے

نیشنل بک سینٹر کے انعامات

کراچی ۲ مارچ۔ نیشنل بک سینٹر آف پاکستان نے ۱۹۶۶ء میں چھپی ہوئی دیدہ زیب اور خوب صورت کتابوں پر انعامات کا اعلان کیا ہے۔ ججوں نے کسی کتاب کو پہلے انعام کا مستحق قرار نہیں دیا ہے۔ دوسرا انعام بڑوں کی کتابوں میں نذر رحمان کو دیا گیا ہے اور بچوں کی کتابوں میں "بچوں کے لئے حدیث" کو ملا ہے۔ فن کاروں میں جناب عبدالرحمن چغتائی کو ضیا جالندھری کی کتاب نارسا کے سرورق پر انعام کا مستحق سمجھا گیا ہے اور دوسرا انعام جنگ کے کارٹونسٹ جناب زیدی کو حفیظ جالندھری کی کتاب "بچوں کا بینک" پر دیا گیا ہے۔

افریشیائی مصنفین کانفرنس

بیروت ۲۳ر فروری ایفروایشیائی ممالک کے مصنفین کی کانگریس کی تیسری کانفرنس بیروت میں منعقد ہو رہی ہے۔ جس میں افریقہ اور ایشیا کے ۳۰۰ مصنفین کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے ۷۰ ممالک کے نمائندے بھی شریک ہو رہے ہیں۔ اس کانفرنس میں ایفروایشیائی مصنفین کی انجمن کے لیے قوانین وضع کئے جائیں گے اور "مصنف اور تحریک آزادی کے درمیان رشتہ" پر تبادلہ خیال کیا جائے گا۔

دیدہ زیب کتابوں کی نمائش

نیشنل بک سینٹر کے زیر اہتمام ۶ر مارچ کو کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں دیدہ زیب کتابوں کی نمائش کا افتتاح ہوا۔ اس نمائش میں چھ سو کتابیں شریک کی گئی ہیں جن میں سے چار سو انگریزی کی ہیں۔ اور دو سو اردو کی۔ عوام کی توجہ کا مرکز ۱۸۲۰ء میں دہلی سے چھپی ہوئی ایک کتاب "تذکرہ عالم شہ" ہے جس میں دو رنگوں کی تصاویر ہیں۔ اس موقع پر ٹیلی ویژن کے ڈائرکٹر جناب ذوالفقار علی بخاری نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اخبارات ٹائپ میں شائع ہونا چاہئیں۔ جناب بخاری نے صنعتی کتابوں کی اشاعت پر زور دیا ہے۔

آئینہ خانے میں

رشید احمد صدیقی / ایک موضوع

کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی افتتاحی تقریب میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور مزاح نگار جناب رشید احمد صدیقی کی ذات اور اُن کا فن تھا۔ مقررین نے رشید احمد صدیقی کی شخصیت اور اُن کے فن پر سیر حاصل خیالات کا اظہار کیا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ مذاکرہ کی صدارت جناب ڈاکٹر محمود حسین فرما رہے تھے۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والے حضرات میں شان الحق حقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر سید محمد شفیع، ڈاکٹر سید شاہ علی، جمیل نقوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

عبداللہ ریاض صاحب کی آمد

لاہور — ۲۴ر فروری مجلس ایران کے اسپیکر جناب عبداللہ ریاض جو ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ اورینٹل کالج لاہور میں تشریف لائے اس موقع پر انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ فارسی اور اردو ادب کا سرچشمہ اسلامی ادب ہے اور یہ ادب ہمیں صرف قرآن حکیم ہی میں ملتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ہزار سعدی اور ہزار حافظ و فردوسی بھی فارسی ادب پر اتنا گہرا اثر نہ ڈال سکے۔ جتنا قرآن حکیم کی ادبی خصوصیات نے ڈالا ہے

پروفیسر حمید عسکری کا امتیاز

پروفیسر حمید عسکری پاکستان کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے رائٹرز گلڈ کی طرف سے سائنس کی کتابوں پر تین اول انعام حاصل کیے ہیں۔ ان کتابوں میں جو انعام کی مستحق سمجھی گئی ہیں۔ برق و مقناطیس — مادے کے خواص۔ حرارت شامل ہیں جن پر یکے بعد دیگرے مصنف کو انعامات سے نوازا گیا۔ پروفیسر موصوف جن اور کتابوں پر کام کر رہے ہیں اُن کے نام یہ ہیں — روشنی — جدید طبعیات — انسائیکلوپیڈیا طبعیات —

حبیب جالب فنڈ

لاہور کے شعراء اور اہل علم نے مشہور شاعر حبیب جالب کے خاندان اور اہل وعیال کی امداد کے لیے ایک فنڈ قائم کر دیا ہے۔ حبیب جالب کو اکثر قید وبند کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک چار رکنی فنڈ کمیٹی بھی بنادی گئی ہے اس فنڈ میں عطیات بیگم حبیب جالب فردوس پارک سنت نگر لاہور کے پتے پر بھیجے جاسکتے ہیں۔

یادوں کے چراغ

یوم اقبالؒ

شاعر مشرق علامہ اقبال کی انتسویں برسی پر ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ اپریل کو کراچی میں ایک شاندار پروگرام ترتیب دیا جارہا ہے جو تین اجلاس پر مشتمل ہوگا۔ یوم اقبال کا یہ پروگرام یونیورسٹی انتظامیہ کمیٹی نے منظور کیا ہے اس سلسلے میں خواتین کا ایک خصوصی اجلاس بھی ہوگا جس کی صدارت بیگم رعنا لیاقت علی خاں کریں گی اس میں شرکت کے لیے علامہ اقبال کی صاحبزادی بیگم منیر صلاح الدین خاص طور پر کراچی آئیں گی۔ ایک عام نمائش بھی ہوگی جس میں علامہ اقبال کی نادر ونایاب کتابوں خطوں اور تحریروں کی نمائش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ پہلی بار اقبالؒ کے پیغام کو تصویری صورت میں دکھایا جائے گا۔ کلام اقبال کو ملک کے مشہور عالم مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائی نے مصور کیا ہے مصوری کا ایک مقابلہ بھی ہوگا جسمیں انعامات بھی تقسیم کئے جائینگے۔

یوم اقبال کی اس شاندار تقریب میں شرکت کے لیے متحدہ عرب جمہوریہ۔ ترکی۔ انڈونیشیا۔ افغانستان۔ چیکوسلاویکیہ۔ فرانس۔ چین۔ برطانیہ۔ امریکہ اور مغربی جرمنی سے ادیبوں کی بڑی تعداد کراچی پہنچ رہی ہے ایک محفل موسیقی کا انعقاد بھی ہورہا ہے جس میں پاکستان کے ممتاز موسیقار حصہ لے رہے ہیں۔ طلبہ کے لیے ایک مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے جس میں بہترین طالب علم مقررین کو انعامات دیے جائیں گے۔ ایک طرحی مشاعرہ بھی پروگرام میں شامل ہے۔ جس میں ملک کے تمام ممتاز شعراء شرکت کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال کی زندگی اور پیغام پر ایک ڈرامہ بھی پیش کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ مقامی سینما گھروں میں علامہ کی حیات وپیغام پر دستاویزی فلمیں دکھائی جائیں گی۔ اس اہم اور شاندار تقریب کے سلسلے میں محکمہ ڈاک تار یادگاری ٹکٹ بھی جاری کر رہا ہے۔

ماتم میں ہم شریک

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ...

اسلامی تہذیب اور علم وادب کا سرپرست، مسلمانوں کے اقتدار کا آخری چراغ، اردو کا مربی اور محسن ۲۴ فروری کو حیدرآباد دکن میں پورے عالم اسلام کو داغ مفارقت دے گیا۔ میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نظام دکن کی وفات کی خبر برصغیر پاک وہند اور عالم اسلام میں یکساں غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی۔ وہ صرف ایک ریاست کے حکمران ہی نہ تھے، دنیا کے امیر ترین افراد ہی میں شمار نہ کئے جاتے تھے اور صرف سلطنت آصفیہ کے آخری چراغ ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک عظیم انسان، انسانیت کے پرستار، علم وادب کے سرپرست، اسلام کے والہ وشیدا اردو کے عاشق ومحسن تھے۔ جبتک اردو قائم ہے، جب تک اسلامیان ہند کا علمی سرمایہ برقرار ہے جب تک علم وادب کی شمع روشن ہے اس میں نظام کی ذات ایک لازمی جزو کی طرح زندہ اور

شامل رہے گی۔ بادشاہ اور حکمراں بھی افراد ہوتے ہیں۔ اور افراد تو فنا ہوتے رہتے ہیں۔ آج دنیا کے کتنے بادشاہ اور حکمراں ہیں جنھیں ہم اور آپ جانتے ہیں صرف وہی جنھوں نے تاریخ کے صفحات سے اٹھ کر عالم انسانیت کو محیط کر لیا ۔ نظام حیدرآباد بھی ایسے ہی گنتی کے افراد میں شامل ہیں۔

بیگم حسن مخفی کا انتقال

اردو کے ادبی حلقوں کو یہ سُن کر افسوس و رنج ہوگا کہ مشہور شاعرہ اور ادیبہ بیگم حسن مخفی کا انتقال ۱۹ فروری کی رات کو کراچی میں ہوگیا ہے خدا مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔ ادارہ قومی زبان بیگم حسن مخفی کے خاندان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

مقصود شہزاد کی رحلت

تاشقند ۲۰ فروری۔ ازبکستان کے مشہور و ممتاز شاعر مقصود شہزاد کا انتقال ۲۰ فروری کو ہوگیا ہے اُن کی عمر ۵۸ برس تھی اور وہ اس علاقے کے سب سے ممتاز اور مقبول شاعر و ادیب تھے۔ اُن کے شعری مجموعوں اور ڈراموں نے پورے روس میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اور وہ روس کے اہم ترین فن کاروں میں شمار ہوتے تھے۔ مقصود شہزاد کی خدمات اس لیے بھی ہمیشہ یادگار رہیں گی کہ انھوں نے شیکسپیئر اور گوئٹے کی تخلیقات کا روسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

آئینۂ ہند

ایک اہم اعلان

ہندوستان کے صوبہ مدراس کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والی دراوڑ کازگام پارٹی کے رہنما جناب این انادرائے نے اعلان کیا ہے کہ وہ سب سے پہلے بھارتی آئین کی اس شق میں ترمیم کرانے کی جدوجہد کریں گے جو ہندوستان کی چودہ علاقائی زبانوں کے بارے میں ہے باقی زبانوں کو ہندی کے برابر درجہ دیا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ ہم محض ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان نہیں بننے دیں گے یہ واضح رہے کہ مدراس میں کانگریس کی زبردست شکست بھی ہندی کی بے جا تائید کا نتیجہ ہے۔

اردو کا خیال

ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے یوپی اور بہار کے وزرائے اعلیٰ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ "ایسے انتظامات پر فوری توجہ دی جائے جن سے تعلیمی انتظامی اداروں میں اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہو۔" انہوں نے بلرام پور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ "جن علاقوں میں اردو کی تعلیم کے لیے معقول انتظامات نہ ہونے چاہئیں وہاں یہ انتظامات نہیں کیے گئے ہیں۔" انھوں نے پھر یہ یاد دہانی کرائی کہ "یہ صورت حال تکلیف دہ ہے۔ حکومت کو اردو کی تعلیم کی ضرورت کا پورا احساس ہے۔"

ادیبوں کی خدمت

معلوم ہوا ہے کہ حکومت یو۔پی۔ (اتر پردیش) نے ۱۰۰ ادیبوں اور فن کاروں کو مالی امداد دینے کا اعلان کیا ہے یہ امداد یکم مارچ ۶۷ء سے ۲۸ فروری ۱۹۶۸ء تک برابر جاری رہے گی۔

ہندوستان ٹائمز کا اداریہ

ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنے ایک حالیہ اداریہ میں "مسلمانوں کے ساتھ انصاف" کے زیر عنوان ایک نئی جائز لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں جس قوم کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی ہوئی ہے وہ مسلمان ہیں۔ اخبار نے اس رجحان کی شدید مذمت کی ہے اور ایسے تمام مسائل پر کھل کر لکھا ہے جو مسلمانوں کے لیے آزار کا باعث ہیں۔ ان مسائل میں اردو بھی شامل ہے۔ اس اخبار نے لکھا ہے کہ ۔۔۔ "مسلمانوں کی شکایت

کی ایک بنیادی وجہ اردو ہے جو مسلمانوں کی ثقافتی زبان ہے اور جس کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اخبار مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو کی جڑیں ہندوستان کی دھرتی کی گہرائی میں ہیں اور وہ ہندوؤں کی بھی بلا امتیاز مادری زبان ہے۔ اخبار نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر فوری توجہ دے اور اردو کو اس کا جائز اور صحیح مقام دے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا اعزاز

اردو زبان کے محقق اور انشاپرواز شانتی رنجن بھٹاچاریہ کو اورینٹل کالج بمبئی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی گئی ہے یہ سند انہیں تذکرہ تصانیف اردو بنگال پر دی گئی ہے اس کتاب میں انیسویں صدی کے آخر تک کی اردو کتابوں کے بارے میں تفصیلات مہیا کی گئی ہیں جو بنگال میں طبع اور شائع ہوئیں۔ ہر کتاب کے مصنف کے حالات بھی دیئے گئے ہیں۔ بنگال میں اردو زبان کی رفتار ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کتاب ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ پہلے بھی ایک اہم تحقیقی کتاب "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" لکھ چکے ہیں۔ اس کتاب پر حکومت مغربی بنگال نے مصنف کو پانچ ہزار روپے کا ٹیگور انعام دیا تھا۔

ہندوستان میں اردو ادب اور زبان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کام ہو رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر شانتی رنجن جیسے محققوں ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔

غبار خاطر پر ایک نظر

پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں حال ہی میں ایک جلسہ ہوا جس میں جناب مالک رام صاحب نے غبار خاطر پر مقالہ پڑھا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے فرمائی۔ مالک رام صاحب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ کہنے کو تو غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوں کی شکل دے دی گئی ہے۔ مالک رام صاحب کے مقالے کے دو حصے تھے پہلے میں انہوں نے مکتوب الیہ کے خاندان پر روشنی ڈالی اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اس خاندان کے عروج و زوال کی داستان بیان کی اور مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کی علمی و قومی خدمات کا ذکر کیا دوسرے حصے میں غبار خاطر کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے حالات اور ان کی شخصیت کے بارے میں معلومات اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتیں۔ اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوب تحریر ہے مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا نقطہ معراج غبار خاطر ہی ہے اس کی نثر ایسی پنی تلی ہے۔ اور الفاظ کا استعمال یہاں افراط و تفریط سے اس حد تک بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں بہت ناہمواری تھی۔ اور عوام تو درکنار متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہو سکتا تھا اس کے برعکس غبار خاطر ہے ایک نئی دنیا نظر آتی ہے اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دل نشین ہے کہ ہر شخص اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اور تو اور مشکل پیچیدہ موضوعات کے بیان میں بھی اسلوب تحریر کی دل کشی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ اس مجموعے کے بعض مباحث بادی النظر میں بہت معمولی ہیں۔ مثلاً چڑا یا چڑے کی کہانی۔ لیکن مولانا آزاد کے جولانی قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر کئی صفحات قلم بند کر دیئے ہیں ان خطوں کا ایک اور مابہ الامتیاز ان کا طنز یہ رنگ ہے جو جا بجا الفاظ کا پردہ چاک کر کے جھلکنے لگتا ہے۔ مالک رام صاحب نے مزید کہا کہ مولانا کی تحریر کی ایک اور قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ خواہ معمولی سے معمولی چیز کا ذکر ہو وہ اسے دائمی صداقتوں

اور ابدی اقدار سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فاضل مقالہ نگار نے مثالیں دے کر بتایا کہ مولانا آزاد عام واقعات کو فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے کے عادی تھے۔ مولانا آزاد مکہ (حجاز) میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اگرچہ مشق اور مزاولت سے انہیں اردو پر پوری قدرت حاصل ہوگئی تھی لیکن تلفظ میں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے اور اس کی مثالیں ان کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔ مولانا اشعار کے برمحل استعمال کے غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے بخبار خاطر میں کوئی سات سو اشعار آئے ہیں۔ مرحوم انہیں اپنے حافظے سے لکھتے تھے شاید اسی لیے بہت جگہ لفظی تفاوت ہے بعض اوقات وہ موقع کی ضرورت سے شعر میں دانستہ بھی ردوبدل کر لیتے تھے۔

مقالے سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر و صدر شعبہ اردو پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ نے جناب مالک رام صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب دونوں کے کارنامے الگ الگ ہیں لیکن ایک خوبی دونوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ دونوں کے فرائض منصبی کا اردو زبان و ادب سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن دونوں نے جی جان سے اردو کی خدمت کی ہے اور اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کر دی ہے۔ مالک رام صاحب غالبیات کے ماہر ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جو کام کیا ہے اس سے عامی تر عالم سب یکساں طور پر استفادہ کرتے ہیں ان کی تصنیف کی تعداد زیادہ نہیں اور ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے وہ ان پیشہ ور ادیبوں کی طرح نہیں جو ساری عمر کاغذ کالا کرتے رہتے ہیں اور اگرچہ جانتے ہیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن محض اس لیے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں کہ ادب کی تجارت ان کا پیشہ بن جاتی ہے۔ مالک رام صاحب نے جو کام بھی کیا ہے پوری دیانت داری محنت اور دلسوزی سے کیا ہے وہ صلہ و ستائش اور نام و نمود سے بے نیاز رہے ہیں۔ اردو میں گفتار کے غازی بہت ملیں گے کردار کے غازی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ باتیں بنانا ہماری کمزوری ہے، کام سے ہم دور بھاگتے ہیں۔ مالک رام صاحب نے نام کو نہیں کام کو مقصد بنایا ہے پچھلے سال نذر عرش اور کربل کتھا کی اشاعت اس کی بہترین مثال ہے۔ کربل کتھا کی اشاعت مالک رام صاحب اور ڈاکٹر آرزو دونوں کی مرہون منت ہے کربل کتھا کا مقدمہ متن، حواشی تخلیقات، اشاریے سب کچھ نہایت محنت سے تیار کیا گیا ہے اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ دیوان غالب۔ نسخہ عرش اور کربل کتھا کی اشاعت سے اردو میں ادبی ایڈیٹنگ کا ایک نیا معیار سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بارے میں ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ ان کی تصانیف سے اردو زبان میں ادب کا وزن بڑھا ہے۔ غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے یا نہیں لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس کی جڑیں ہماری جذباتی و تہذیبی زندگی میں دور دور تک پیوست ہیں یوں تو غزل پر فتوے کے دفتر سیاہ کر دیے گئے ہیں لیکن اس کی افہام و تفہیم کا حق صحیح معنوں میں یوسف صاحب ہی نے ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں سب سے بڑی خوبی ان کی نظر کی جامعیت ہے وہ قدیم و جدید فلسفہ و نفسیات اور تاریخ و ادب سب کے رمز آشنا ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھرپور علمیت ملتی ہے ان میں وہ یک رخاپن نہیں جو ہمارے موجودہ تنقید کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ جامع تنقید کے لیے جس بصیرت اور آگہی تخلیق حسن موضوعیت اور معروضیت اور ہمدردی و بے تعلقی کی ضرورت ہے اس کی اچھی مثالیں یوسف صاحب کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب پتھر پر کام کرنے والوں میں ہیں ان کے ہاں علمی انکسار اور اعتدال پسندی ملتی ہے ادعا پسندی نہیں۔ مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مولانا

بنیادی طور پر رومانیت پسند تھے۔ ان کی قومیت ہو یا اسلامیت دونوں کی نوعیت رومانی ہے وہ عبدہ اور رشید رضا کی تحریروں سے متاثر تھے اور انہوں نے فرانسیسی علم و ادب کے عربی ترجموں سے استفادہ کیا تھا۔ غبارِ خاطر کے اسلوب اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے فرانسیسی مصنف (ONTESQUIEU 1689-1755) کے PERSIAN LETTERS سے مشابہت رکھتے ہیں۔

اپنے زمانے کا مشہور سیاسی مفکر تھا اور اس کے خطوط کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ یقیناً مولانا کی نظر سے گذرا ہو گا MONTESQUIEU کے خطوں میں مشرقی فضا ملتی ہے۔ اسکے مخاطب ایرانی تھے انکے خط کسی شخص کے نام نہیں۔

غبارِ خاطر میں بھی حبیب الرحمٰن شروانی کی ہستی ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اپنے ابتدائی طرزِ نگارش سے عام فہم نثر کی اس روایت کو بدلنے کی کوشش کی جس کا آغاز غالب و سرسید و حالی سے ہوا تھا یہ ایک طرح کی بدخدمتی تھی۔ اردو زبان کا GENIUS کیونکہ عام فہم اور سہل پسندی کا ہے، اور مولانا کا اسلوب اس کے خلاف تھا اس لیے اردو کے بنیادی اسلوب کو بدلنے میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی ان کی نثر اگرچہ فسانۂ عجائب کی نثر نہیں، لیکن یہ سرسید و حالی و عبدالحق کی نثر بھی نہیں۔ اسلوب کی سطح پر مولانا نے رومانیت کو فروغ دیا۔ ان کی شخصیت میں ایک طرح کا تصنع تھا اور یہ تصنع ان کی نثر میں بھی ہے وہ آرائش کا بہت خیال کرتے تھے اور اپنے مسودات میں کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ ان کی نثر میں جاذبیت اور حسن تو ہے لیکن ان کا آرٹ تصنع کا آرٹ ہے، یہ زندگی کا آرٹ نہیں اور اس میں وہ بے ساختگی اور فطری پن نہیں جو غالب کے آرٹ کا وصف ہے۔ مولانا ادیب اتنے بڑے نہیں تھے جتنے بڑے سیاستدان تھے وہ صحیح معنوں میں ایک قائد تھے اور انہوں نے ملک و قوم کی نہایت اہم خدمات انجام دیں۔

آخر میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے فاضل مقرر جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ موصوف نے کہا کہ تحقیق اور ادبی تنقید کا نصب العین حق کی تلاش اور ان قوموں کی دریافت ہے جو زبان و ادب کی تشکیل کے پیچھے بروئے کار ہوتی ہیں جناب مالک رام اور ڈاکٹر یوسف حسین خان دونوں نے اردو میں تحقیق اور تنقید کا معیار و اعتبار پیدا کیا ہے

(مرسلہ :- امین عالم راکھی)

پاپولر انگریزی اُردو ڈکشنری :- بابائے اردو

کالج اور مدارس کے عام طالب علموں نیز عام پڑھنے والوں کیلئے خاص طور پر یہ ڈکشنری تیار کی گئی ہے جو انجمن کی دیگر ڈکشنریوں سے مختصر بھی ہے اور کم قیمت بھی۔ قیمت :- چھ روپے پچاس پیسے۔

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اُردو روڈ۔ کراچی

ماہنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	میاں بشیر احمد	خواجہ غلام السیدین	رئیس احمد جعفری
ماہر القادری	فرقت کاکوروی	نواب مشتاق احمد خاں	ڈاکٹر محشر عابدی	ڈاکٹر احسن فاروقی
سید شبیر علی کاظمی	ڈاکٹر وزیر آغا	سید قدرت نقوی	رئیس امروہوی	ابوسلمان شاہجہانپوری

اور دیگر اہلِ قلم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ

★ ★ ★

"مرقع عبدالحق" کے نام سے بابائے اردو کی دو درجن سے زائد نایاب تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

"بزم عبدالحق" کے عنوان سے بابائے اردو کے دوستوں اور نیازمندوں کا تذکرہ۔

بابائے اردو کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط

★

آفسٹ کی چھپائی، عمدہ سفید کاغذ —— صفحات ساڑھے تین سو قیمت چھ روپے

انجمن ترقی اردو — بابائے اردو روڈ — کراچی ۱

ابو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

(اشاریہ بابت ماہ ستمبر ۶۶ء)

ادبیات اردو
تاریخ و سیاسیات
تعلیمات
تہذیب و تمدن
سائنس و طب
سیر و سیاحت
شخصیات
آزاد، مولانا ابوالکلام
اقبال حضرت علامہ
عبدالحق، بابائے اردو مولوی
غالب، اسداللہ خاں
دیگر شخصیات
صحافت
کتابیات و کتب خانے
لسانیات
مذہبیات
سیرت و سنت نبوی صلعم
قرآن و تفسیر
مسائل و مباحث
نفسیات

پیش نظر اشاریہ کی ترتیب میں ستمبر ۶۶ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات سے مدد لی گئی ہے

سہ ماہی اردو نامہ کراچی ستمبر ۶۶ء ماہنامہ جامعہ دہلی ستمبر ماہنامہ کتابی دنیا کراچی ستمبر
ماہنامہ افکار " " چراغ راہ کراچی " " ماہ نو " اگست و ستمبر
پندرہ روزہ الارشاد " ۱۶ جولائی و یکم اگست " خاتون دکن حیدرآباد " " معارف اعظم گڑھ ستمبر
ماہنامہ البلاغ بمبی ستمبر " رہنمائے تعلیم دہلی " " مولوی دہلی "
" الرحیم حیدرآباد " " زندگی رام پور " " ہمدرد ماہ لاہور اگست
" انجمن اسلامیہ میگزین کراچی " " سب رس حیدرآباد اگست " میثاق " "
" انوار اسلام رام نگر بنارس " " شاعر بمبی اگست ستمبر " ہمایوں دہلی ستمبر
" آجکل دہلی اگست ستمبر " صبح دہلی " " ہمدم کراچی آزادی نمبر
" برہان " ستمبر سہ ماہی صدف کراچی جلد ۴ نمبر ۴ ہفت وار رسائل
" بہائی میگزین لاہور " ماہنامہ صبح امید بمبی ستمبر آئین لاہور۔ المنبر لائل پور۔ چٹان لاہور۔
" بینات کراچی " " طلوع اسلام لاہور " شہاب لاہور - صدق جدید، لکھنؤ —
" پکچر (تاجور نمبر) لاہور ۶۵ء " عارف لاہور " قندیل لاہور - لاہور، لاہور - ہماری زبان علی گڑھ -
" پیام عمل " ستمبر " عالمی ڈائجسٹ کراچی " روزنامے
" تاج کراچی اگست " فاران " "
" تجلی دیوبند ستمبر " فروغ اردو لکھنو " انجام کراچی (صرف اشاعتہائے جمعہ و اتوار)
" تحریک دہلی " " فکر و خیال کراچی اگست جنگ "
" ترجمان القرآن لاہور " " فکر و نظر راولپنڈی مئی تا جون و ستمبر حریت "
" تہذیب الاخلاق " " " قومی زبان کراچی ستمبر
" ثقافت " " " کتاب لاہور "

ادبیات اُردو

احمد، انیس	دورِ جہاد کا افسانوی ادب	چراغ راہ، ص ۱۷ تا ۲۳، ستمبر
احمد دین مرحوم، مولوی	مجاز و حقیقت	قومی زبان، ص ۳۳ تا ۳۴، "
احمد، مختار	ادیب، قومیت اور نظریہ	چراغ راہ، ص ۳ تا ۶، "
اختر، شمیم	ادب، سائنس اور زندگی	تاج، ص ۲۵ تا ۲۷، اگست
ارشاد، سید نقی احمد	حافظ کا اثر شعرائے اردو پر	شاعر، ص ۱۸ تا ۲۲، ستمبر
اعظمی، انجم	تقسیم کے بعد (اردو ادب)	افکار، ص ۳۱ تا ۳۴ + ۴۶، ستمبر
اعظمی، عبدالطیف	قومی شعور اور ادیب	صبح، ص ۶ تا ۸، اگست ستمبر
تاباں، مسعود قمر	نئی شاعری نیا زاویہ	شاعر، ص ۱۰ تا ۱۳، اگست
جعفری، رئیس احمد	گزشتہ جنگ کا اثر ہمارے ادب و شاعری پر	انجام، ص ۹، ۷ ستمبر
چودھری، جے کرشن	جائسی کے بارہ ماسے	آج کل، ص ۳۲ تا ۳۶، ستمبر
حامد، حکیم سید حامد علی	صحت مند شعر کے اقادی پہلو	تاج، ص ۲۸ تا ۳۰، اگست
حقی، وحید الحق	تہذیب، تمدن اور معاشرت پر زبان کا اثر	ہمدم، ص ۸۹ تا ۹۵،
دیپ، چندر	"پردہ غفلت" پر ایک نظر	شاعر، ص ۱۰ تا ۱۲، ستمبر
رئیس امروہوی	خیال سے خبط تک	جنگ، ص ۷، ۲۶ "
رئیس، ناظر حسن	اردو ادب میں یورپین شعراء کا حصہ	ماہ نو، ص ۱۵ تا ۲۸ + ۵۹، ستمبر
سدید، انور	غلام الثقلین نقوی کے افسانے	" " ۲۱ تا ۲۸ + ۶۲، اگست
سرور، پروفیسر آل احمد	نظم کی زبان	افکار، ص ۳۵ تا ۳۱، ستمبر
صدیقی، محمد اسحاق (مترجم)	ملیالم ادب	کتابی دنیا، ص ۱۰ تا ۱۲، "
صدیقی، محمد شکیل احمد	مومن فارسی غزل کے آئینے میں	فروغ اردو، ص ۳ تا ۱۰، "
طالب دہلوی	دلی کی شاعری کا ایک اسکول (۸)	رہنمائے تعلیم، ص ۱۰ تا ۱۲، "
عالم، غیور	باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ	قومی زبان، ص ۴۵ تا ۵۰، "
علی، سید ساجد	ہماری شاعری	" " ۳۵ تا ۳۸، "
علیمی، سید اکمل	اردو ادب پر جنگ کے اثرات	انجام، ص ۹، ۷ ستمبر

علی، ڈاکٹر بشارت	فارقلیط (تصنیف عبدالعزیز خالد) پر ایک عمرانی نظر[۱]	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۸، ۱۹ ستمبر
عنوان چشتی	اردو کی صوفیانہ شاعری	جامعہ، ص ۱۴۵ تا ۱۶۰، ستمبر
فاروقی، ضیاء الحسن	کاروان فکر (مجموعہ مضامین ڈاکٹر یوسف حسین خاں)	,, ص ۱۲۳ تا ۱۳۱، ,,
فاروقی، نثار احمد	آثار الصنادید	آج کل، ص ۲۳ تا ۲۹، ,,
قریشی، ڈاکٹر وحید	ادب کا نیا دور جنگ کے بعد	قندیل، ص ۱۳ تا ۲۱، ۲۰، ۲۳ ستمبر
منیر، انوار	لیلی اور لیلی کے خطوط	شاعر، ص ۵۴ تا ۷۴، ستمبر
نامی، ڈاکٹر عبدالعلیم	اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ (خورشید)	,, ,, ۶۵ تا ۶۷ + ۶۶، اگست
ناز، ایم الیس	سرحد کی لوک کہانیاں	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۲۵ ستمبر
نظیر صدیقی	اردو شاعری کا مزاج (ڈاکٹر وزیر آغا)	ماہ نو، ص ستمبر
یاور، غبار	شاعری میں غفلیت	صدف، ص ۱۰ تا ۱۳،

تاریخ وسیاسیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد کے سیاسی حالات	الرحیم، ص ۲۷۳ تا ۲۸۵، ستمبر
اسرار احمد	تحریک جماعت اسلامی ــ نقض غزل	میثاق، ص ۳۳ تا ۵۶، ,,
اطہر مبارک پوری، قاضی	اسلامی علوم کے عوامی مراکز مجالس اور امالی	البلاغ، ص ۲۳ تا ۳۵، ,,
انصاری، ڈاکٹر محمد ولی الحق	شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز	معارف، ص ۲۲۱ تا ۲۳۱، ,,
آفندی، راجہ محمد زبیر خاں	تاریخ پاکستان کے گزشتہ آٹھ سال	انجام، ص ۵، ۵ ستمبر
بولائیتھو، ہیکٹر		
زبیر صدیقی (مترجم)	قائد اعظم اور قومی جدوجہد	جنگ، ص ۴، ۱۲ ستمبر
حفیظ اللہ پھلواروی، محمد	حضرت اورنگ زیب عالم گیر کی رواداری	فاران، ص ۴۴ تا ۵۸، ستمبر
,, ,,	رسالت اور خلافت راشدہ میں علمی ترقیاں	انجام، ص ۶، ۱۰ ستمبر
جعفری، سید شبیر حسین	سعودی عرب	,, ,, ۲، ۵، ,,

---

[۱] اس مضمون کی دوسری قسط ۲۶ ستمبر کے چٹان میں ص ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آباد شاہ پوری	مسلمان قوم اشتراکیت کے سائے میں[۱]	آئین، ص ۱۰ تا ۱۱، ۳۱ اگست
جعفری، رئیس احمد	تاریخ پاکستان کی جھلکیاں[۲]	انجام، ص ۱۲، ۳ ستمبر
حامدی، خلیل	افریقہ میں اسلام کا ماضی	ترجمان القرآن، ص ۶۰ تا ۶۷، ستمبر
" "	مصر اور اخوان	" ، ۶ تا ۱۲ + ۶۹ تا ۸۷، "
حسین، اسلام	متحدہ عرب جمہوریہ ـ شہنشاہیت سے جمہوریت تک	ہمدم، ص ۶۷ تا ۷۱، "
حسین، اعجاز	مجاہدین الجزائر کی جدوجہد آزادی	" ، ۵۳ تا ۵۷، "
خواجہ، مشفق	قائداعظم کے دو غیر مطبوعہ خط[۳]	جنگ، ص ۵، ۱۲ ستمبر
دریابادی، مولانا عبدالماجد	علی گڑھ ـ کیا تھا، اور کیا ہے؟	صدق جدید، ۵، ۳۰ "
راشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب[۴]	جنگ، ص ۱۲، ۳ "
زیدی، علی جواد	لکھنؤ کے شب و روز (۱۷۷۵ء تا ۱۸۳۰ء)	صبح، ص ۲۵ تا ۳۸، اگست ستمبر
سروش، رفعت	نقوش دلی (۴۳ء - ۴۵ء)	" ، ۳۹، اگست ستمبر
سواتی، مولانا حکیم فضل الرحمان	سرسید اور دیوبند	برہان، ص ۱۶۵ تا ۱۷۸، "
سہیل، محمد اقبال	اتحاد عالم اسلام اور سامراجی عزائم	آئین، ص ۸ تا ۹، ۳۱ اگست
صابر، ڈاکٹر محمد	ترکیہ و پاکستان	ماہ نو، ص ۵۰ تا ۵۳، ستمبر
طاہر، سید جعفر	میر غلام بھیک نیرنگ اور ان کی شاعری[۵]	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷ تا ۱۸، ستمبر
عالم، خورشید	بھارت کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۳۳ تا ۴۱، "
عبدالحق، ڈاکٹر محمد	چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی مذہبی اور ادبی صورت حال	فکر و نظر، ص ۶۹۹ تا ۷۱۰، اپریل مئی
عبدالقادر، شیخ	(ملک) کہاں ہے	لاہور، ص ۵، یکم اگست

۱؎ سلسلہ مضمون ۷ ستمبر اور ۱۰ ستمبر تک جاری ہے۔

۲؎ اس سلسلے کی دیگر اقساط اس ماہ کے جمعہ ایڈیشنوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

۳؎ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر مظفرالدین قریشی کے نام

۴؎ قومی اور بین الاقوامی سیاسی مسائل و اخبار پر تبصرہ اور تاریخ کا مستقل سلسلہ، مضامین دیگر اقساط کے لئے دیکھئے ۱۰ اور ۲۴ ستمبر کا روزنامہ جنگ کراچی ۔ ۵؎ ماہنامہ قومی زبان کراچی سے منقول۔

عبدالرحمان، سید صباح الدین	سولہویں اور سترہویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں	معارف، ص ۱۸۴ تا ۲۰۶، ستمبر
علی، ڈاکٹر جواد	تاریخ طبری کے ماخذ	برہان، ص ۱۶۳ تا ۱۷۴، "
عمر، محمد	دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب	آجکل، ص ۵ تا ۱۹، ستمبر
غازی، عبدالحمید	صدر ناصر اور اخوان میں کشمکش	المنبر، ص ۱۵ + ۲۲، ۹، ۱۶ ستمبر
فاروقی، محمود	اسلام کا عسکری نظام	حریت، ص ۳ + ۸، ۷ ستمبر
لطیف، اختر	چینی عوام کا انقلاب آزادی	ہمدم، ص ۳۳ تا ۳۴،
مجیب، پروفیسر محمد	ترکی پر ایک نظر	جامعہ دہلی، ص ۱۱۵ تا ۱۲۲، ستمبر
مسعود، محمد	مسلمانوں کے ہاں علم ہئیت	الرحیم، ص ۲۶۱ تا ۲۷۲، "
مسٹر، ستیہ دیو	راوی سندھ کی تہذیب اور دید	ہمایوں، ص ۲۹۹ تا ۳۰۶، "
ملک، بختیار	برٹرینڈ امن فاؤنڈیشن رپورٹ (جنگ ویت نام سے متعلق)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۵۲ تا ۶۶، ستمبر
مہر، مولانا غلام رسول	اسلامی اندلس کی ایک جھلک	چٹان، ص ۵ + ۱۸، ص ۲۶ "
ناز، ایم ایس	پہلی جنگ عظیم سے پاک بھارت جنگ تک	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۴، ۱۸ "
نواز، محمد	تحریک جماعت اسلامی کا ایک تحقیقی جائزہ	فاران، ص ۲۲ تا ۳۷، ستمبر
ہارٹ، ایلین	شاہ فیصل سے انٹرویو	ثقافت، ص ۵۰ تا ۵۴، "
بوسٹیس، گراہم	اپوزیشن کے بغیر جمہوریت	تحریک، ص ۲۴ تا ۲۵، "
	اسلامیان ہند — غلامی سے آزادی تک	ہمدم، ص ۱۱ تا ۲۷
	بھنبھور میں ایک قدیم مسجد کی دریافت	انجام، ص ۶، ۲۳ ستمبر
	کشمیر کی سرگزشت (۳)	ثقافت، ص ۵۵ تا ۷۱، "
	مراکش — جنوبی افریقہ کی آزاد ریاست	ہمدم، ص ۳۷ تا ۴۷،
	نقش غزوۂ دسرایا جو عہد نبوی میں ہوئے	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۵ تا ۳۵، ستمبر
	ویت نام — عہد حاضر کا رستا ہوا ناسور	ہمدم، ص ۵۹ تا ۶۵،

تعلیمات

اسلم، رانا محمد	مشنری تعلیمی ادارے	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۳، ۵ ستمبر
حیدر، پروفیسر سجاد	تعلیم و تربیت میں تفریحات کی اہمیت	فکر و خیال، ص ۲۳ تا ۲۵، اگست
دہلوی، حکیم محمد سعید	ہماری دانش گاہیں	لاہور، ص ۱۲ + ۱۴، ۱۵ اگست
قادری، حامد حسن	تعلیم کی ضرورت	فکر و خیال، ص ۱۵ تا ۱۸، اگست

تہذیب و تمدن

امینی، مولانا محمد تقی	ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت	تہذیب الاخلاق، ص ۲۶ تا ۳۷، ستمبر
جاوید، الطاف	موجود صنعتی انقلاب اور مسلم معاشرہ	فکر و نظر، ص ۱۱۶ تا ۱۳۰، ستمبر
عبدالرشید، ڈاکٹر سید	ہمارا کلچر، ہماری تہذیب[1]	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۸ تا ۲۲، ستمبر

سائنس و طب

اعظمی، بدیع الزماں	کہکشاں اور اس سے پرے	آج کل، ص ۳۹ تا ۴۴، ستمبر
آذر، افسر	ہمارا طریقہ علاج — حکیم سید ذاکر حسین سے ملاقات	حریت، ص ۱۰، ۲۴ ستمبر
حسین، حکیم سید ساجد	طب یونان اور ریسرچ	جنگ، ص ۷، ۱۹ "
حسین، وقار	کائناتی شعاعیں	فکر و خیال، ص ۲۶ تا ۲۹، اگست

سیر و سیاحت

ندوی شاہ معین الدین احمد	میرا سفر حج (۳)	معارف، ص ۱۶۵ تا ۱۸۳، ستمبر
ابن انشاء	چین میں چند روز (سفرنامہ چین قسط ۸)[2]	جنگ، ص ۲، ۵ ستمبر

---

[1] منقول از ماہنامہ قومی زبان کراچی [2] دیگر اقساط کے لئے دیکھئے ۱۲ ستمبر، ۱۹ ستمبر اور ۲۶ ستمبر کا جنگ ص ۵ اور ص ۲

شخصیات

سیرت، سوانح و خدمات

آزاد، مولانا ابوالکلام

ابوسلمان شاہجہانپوری	مولانا آزاد کی یاد میں اخبارات و رسائل کے چند خاص نمبر	ہماری زبان، ص ۶ تا ۸، ۱۵ ستمبر
" "	مولانا آزاد کی یاد میں اخبارات و رسائل کے چند خاص نمبر (۲)	" " ۶ تا ۷، ۲۲ "
اعظمی، ابوعلی	الہلال کے دو مختلف فیہ مضمون	" " ۳ تا ۴، یکم "
سعدیہ، رضیہ	فاطمہ بیگم عرف آمنہ بیگم (مولانا ابوالکلام آزاد کی بہن)	چٹان، ص ۹ + ۱۸، ۱۷ ستمبر

اقبال، حضرت علامہ

بیگم، زیب النساء	علامہ اقبال	چٹان، ص ۸ + ۱۲، ۱۹ ستمبر
بیگم عشرت	اقبال	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶ تا ۸، ستمبر
جاوید، الطاف	فرد اور جماعت کا رشتہ — حکمت اقبال کی روشنی میں	فکر و نظر، ص ۶۶۱ تا ۶۷۲، اپریل مئی
صدیقی، محمد مظہر الدین	اقبال اور مسئلہ اجتہاد	" ۷۲۱ تا ۷۵۶، جون
مصطفیٰ، محمد	ڈاکٹر اقبال اور سیموئل راجرس	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ ستمبر

عبدالحق، بابائے اردو مولوی

اختر حسین (صدر انجمن ترقی اردو پاکستان)	بابائے اردو کی پانچویں برسی	صبح، ص ۹ تا ۱۰، اگست و ستمبر
" " "	بابائے اردو کی یاد میں	قومی زبان، ص ۳ تا ۴، ستمبر
اختر، سلیم	چند ہم عصر (مولوی عبدالحق)	ماہ نو، ص ۹ تا ۱۸، اگست
حسرت کاسگنجوی	اردو کا جنازہ (بابائے اردو سے متعلق)	تاج، ص ۱۷ تا ۱۸، "

ایک واقف کار (سہیل عظیم آبادی)

اور الیس ایم سرور	کچھ مولوی عبدالحق کے بارے میں[1]	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، ۸ ستمبر
شہابی مفتی انتظام اللہ	چند یادیں (بابائے اردو سے متعلق	ماہ نو، ص ۷ تا ۸، اگست
عبداللہ، ڈاکٹر سید	بابائے اردو مولوی عبدالحق	صبح، ص ۱۱ تا ۱۵، اگست وستمبر

غالب، اسداللہ خاں

نیر بھوروی	سلسلۂ غالبیات ــ مسلسل	فروغ اردو، ص ۱۲ تا ۱۳، ستمبر
راسے حنیف	میں اور دیوان غالب کی مصوری	کتاب، ص ۴۳ + ۴۵، "
عبدالودود، قاضی	شمع انجمن اور غالب	صبح، ص ۴۸ تا ۴۹، اگست وستمبر
عشق آبادی، سحر	غالب اور عندلیب شادانی	" " ۵۲ تا ۵۶، " "

دیگر شخصیات

احمد، خواجہ جمیل	مہدی سوڈانی	حریت، ص ۱۰، ۳ ستمبر
احمد سعید	سیماب اکبرآبادی ــ ایک شاعر ایک انجمن	شاعر، ص ۶۱ تا ۶۲، "
احمد، مولوی ریاض الدین	امام اکبرآبادی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳۱ تا ۳۴، ستمبر
اختر، کلیم	قائداعظم	قندیل، ص ۲۳ تا ۱۱ ستمبر
اسٹیفن، آر ٹی	پاکستان کا پہلا گورنر جنرل	جنگ، ص ۵، ۱۲ ر "
اعلمی، عبداللطیف	عزیز لکھنوی اور ان کی خصوصیات شاعری	صبح، ص ۱۶ تا ۲۱، اگست وستمبر
"	یاد عزیز لکھنوی	" " ۵ تا ۶، " "
اعظمی، اقبال احمد	حضرت امام اوزاعی	ثقافت، ص ۴۵ تا ۴۹، ستمبر
اکبر لاہوری، چودھری	چند تاثرات (متعلق علامہ تاجور)	کلچر، ص ۱۹ تا ۲۴،
الفت، منشی ہنسراج	علامہ کیفی دہلوی	رہنمائے تعلیم، ص ۱۳ تا ۱۴، "
ایوب قادری، محمد	مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے	الرحیم، ص ۲۸۹ تا ۲۹۸، "

[1] ابوسلمان شاہجہانپوری کے چند سوالات اور جناب آل سرور کے جواب مطبوعہ ہماری زبان ۱۵ اگست کے سلسلے میں

بزمی، پروفیسر خالد	علامہ تاجور کی شخصیت اور ان کی شاعری	پکچر، ص ۷۶ تا ۷۸،
تاجور، علامہ	تاجور کی کہانی تاجور کی زبانی[1]	" " ۹،
چغتائی، محمد اکرام	ولی گجراتی کا نام اور اس کے اختلافات	اردو نامہ، ص ۷ تا ۸، ستمبر
حرمت الاکرام، سید	فیض اور ان کا فن	جامعہ، ص ۱۳۲ تا ۱۳۳، "
حسن، سبط	حسرت موہانی کی شخصیت اور شاعری	صدف، ص ۶ تا ۹،
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	مولانا تاجور سے یگجائی کی ایک یاد	پکچر، ص ۶۵ تا ۶۷،
راہی، کلیم	راجہ مہدی خاں	شاعر، ص ۳۶ تا ۳۷، ستمبر
رضوی، اختر	محمد محسن عرف دودھو میاں ـــ مشرقی پاکستان کے ایک خدا رسیدہ بزرگ	انجام، ص ۵، ۳۰ ستمبر
رفیق، سعید احمد	الکندی	ثقافت، ص ۳۱ تا ۴۴، "
زیدی، علی جواد	رام بابو سکسینہ	ہمایوں، ص ۳۰۷ تا ۳۱۰، "
" "	غنی کاشمیری	معارف، ص ۲۰۷ تا ۲۲۰، "
زیروی، ثاقب	آہ علامہ تاجور	پکچر، ص ۳۵ تا ۳۶،
ساجد، اعتبار	اقبال ارشد	قندیل، ص ۹ تا ۱۰، ۱۱ ستمبر
" "	وزیر پانی پتی	" " ۲۰، ۲۵ "
سامانی، مولانا محمد علی		
سید نفیس الحسینی (مترجم)	سیرت خواجہ گیسو دراز	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۱۲ "
سبط حسن، سید	یزداں و اہرمن کی ازلی پیکار (حکیم زرتشت کے حالات و تعلیمات)	حریت، ص ۱۲، ۵ ستمبر
سحر یوسف زئی	رحمان بابا کا تصوف	ماہ نو، ص ۱۴۱ تا ۱۴۴، اگست
سکسینہ بدایونی، ویریندر پرشاد	جگر بریلوی کا حب وطن	صبح، ص ۳۹ تا ۴۲، اگست و ستمبر
" "	سرور جہاں آبادی اور شاکر میرٹھی	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ ستمبر
سومرو، فیض محمد	منفرد ہستی (قائد اعظم)	ماہ نو، ص ۹ تا ۱۱، ستمبر

---

[1] اس نمبر میں تاجور کے بہت سے مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔

	شمس العلماء، مولانا تاجور نجیب آبادی	پکچر، ص ۲۹ تا ۳۲،
شاہین، سید مبارک علی	قائد اعظم اور کشمیر	انجام، ص ۱۱، ۱۲ ستمبر
شائق، احمد	استاد سید قطب	المنبر، ص ۷، ۹، ۱۶ ستمبر
شجاع، حکیم احمد	شمس العلماء، مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی	پکچر، ص ۴۳ تا ۴۶،
شہابی، انتظام اللہ	حافظ امام الدین اکبرآبادی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۴، ستمبر
صابری، امداد	مولانا محمد سعید مرحوم	قومی زبان کراچی، ص ۵۷ تا ۶۶، ”
صارم، مولانا عبدالصمد	شمس العلماء، تاجور	پکچر، ص ۲۵ تا ۲۸،
صدیقی، محمد علی	وان گو ـ فن، زندگی کی روشنی میں	شاعر، ص ۵۸ تا ۶۰، ستمبر
عاشق ہرگانوی، مناظر	فکر تونسوی کی طنز و ظرافت	” ” ۴۲ تا ۴۴، ”
عبدالرحمان، صباح الدین	عرشی صاحب	قومی زبان، ص ۲۴ تا ۳۲، ”
عبدالوحید خاں، ڈاکٹر	مولانا تاجور نجیب آبادی	پکچر، ص ۳۸،
عثمان، پروفیسر شیخ محمد	آغا خاں مرحوم کے مذہبی تصورات	فکر و نظر، ص ۱۳۱ تا ۱۴۰، ستمبر
عزیز، غلام ربانی	دل شاد	اردو نامہ، ص ۸۴ تا ۸۸، ”
عزیز، نصراللہ خاں	عبدالمجید سالک	صبح، ص ۵۷ تا ۶۲، اگست و ستمبر
فائق، کلب علی	قمرالدین منت (۲)	تہذیب الاخلاق، ص ۳۸ تا ۵۳، ”
فکر تونسوی	نرلش کمار شاد	خاتون دکن، ص ۶ تا ۱۰، ستمبر
قریشی، طفیل احمد	علامہ ابن حزم	الرحیم، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸، ”
قریشی، فضل حق	قائد اعظم کے خاندانی حالات پر ایک نظر	انجام، ص ۱۵، ۱۲ ستمبر
قریشی، محمد عبداللہ	علامہ تاجور کے استاد	پکچر، ص ۱۰،
کامل، مولانا محمد وارث مرحوم	علامہ تاجور	” ” ۳۹ تا ۴۵،
کبریا گمال	رانی کیتکی کی کہانی	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۵، ستمبر
گیت، من منتھ ناتھ	جنگ آزادی کے تین شہید	ہمایوں، ص ۳۳۴ تا ۳۳۹، ستمبر
مجید، حامد	جنرل محمد موسیٰ	قندیل، ص ۲، ۲۵ ستمبر
محب، احسن	سید وحید قیصر ندوی	” ۲ + ۲۳، ۱۸ ستمبر
نظامی، شمس الحق	میرے فاضل استاد مکرم ـ حامد حسن قادری	انجام، ص ۲، ۳ ستمبر

نظر زیدی	علامہ تاجور بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے	پکچر، ص ۴۷ تا ۵۶،
نظیر لدھیانوی، اصغر حسین خاں	علامہ تاجور اور ان کی شاعری	″ ، ۶۹ تا ۷۵،
نیازی، نیرنگ	قائد اعظم کی عالمی شخصیت	انجام، ص ۲ ، ۱۲ ستمبر
وفا راشدی	کوئی غلام مصطفیٰ بحیثیت قومی شاعر	ماہ نو، ص ۳۵ تا ۴۰، ۴۳-۴۴، اگست
ہاشمی، امین	حضرت شاہ ابوالمعالی	عارف، ص ۱۱ تا ۱۶، ستمبر
ہاشمی، وحید الحسن	احسان دانش شاعر فطرت	تہذیب الاخلاق، ص ۵ تا ۲۵، ستمبر
یقیش	ویت نام کا عظیم قائد — ہوچی منہ	عالمی ڈائجسٹ، ص ۶۹ تا ۷۵، ۸۱، ″
	اسعد گیلانی (۲)	چراغ راہ، ص ۳۷ تا ۴۵، ستمبر
نصیر حمید (مترجم)	پاکستان کا مثالی مجاہد — نواب زادہ شیر علی خاں	ماہ نو، ص ۴۵ تا ۵۰، اگست
	جنرل آغا محمد یحییٰ خاں	قندیل، ص ۲۳، ۲۵ ستمبر
	میرا مربی میرا اصلاح کار (علامہ تاجور)	پکچر، ص ۳۳ تا ۳۴،

صحافت

صدیقی، محمد اکبر الدین	رسالہ "افتخار" جاورہ	قومی زبان، ص ۳۹ تا ۴۴، ستمبر
ہیلی، سر ولیم	صحافی اور اس کے فرائض	جنگ، ص ۲، ۱۹ ستمبر

کتابیات و کتب خانے

ابو سلمان، شاہجہانپوری	نئے خزانے (فردی کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان، ص ۷۶ تا ۸۵، ستمبر
ادیب، سید مسعود حسن رضوی	امیر مینائی کی دو کمیاب کتابیں	ہماری زبان، ص ۳ تا ۵، ۲۲ ستمبر
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص ۳۶ تا ۵۲، ۲۲، ″
بیدار، عابد رضا	علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا (ماہنامہ معارف کا اشاریہ)	برہان، ص ۱۷۹ تا ۱۸۷، ستمبر
خلیل، وقار	نادر مخطوطات "ایوان اردو" میں	سب رس، ص ۴ تا ۹، اگست
شرف الدین، ابوالحسن محمد	ابو جعفر الداؤدی اور ان کی تصنیف کتاب الاموال	فکر و نظر، ص ۱۰۷ تا ۱۱۶، ″
عمران خاں، حکیم محمد	ٹونک کے کتب خانے	معارف، ص ۲۳۲ تا ۲۳۸، ″

فاروقی، ظہورالحق	کتاب سازی اور لبریات	کتاب، ص ۶۷ تا ۶۸، ستمبر

لسانیات

اردو نامہ	اردو لغت قسط نمبر ۱۹	اردو نامہ، ص ۳۵۹ تا ۳۷۸، ستمبر
افتخار حسین، آغا	فرانس میں اردو (آخری قسط)	نگار، ص ۳۵ تا ۴۶، ستمبر
پنجابی، ارشاد احمد	مرکزی اردو بورڈ	کتاب، ص ۳۹ تا ۴۲، ”
پنڈت، غلام احمد	کشمیر میں اردو	قومی زبان، ص ۵۱ تا ۵۶، ”
رزمی، کامل	اپ بھرنش	جامعہ، ص ۱۴۹ تا ۱۵۳، ”
رضوی، فرزانہ ناز	اردو ـــ بحیثیت قومی زبان	انجام، ص ۷، ۵ ستمبر
سبزواری، ڈاکٹر شوکت	اشتقاقیات	اردو نامہ، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴، ستمبر
عبداللہ، ڈاکٹر سید عبداللہ	عربی کا مسئلہ	قومی زبان، ص ۱۹ تا ۲۳، ”
فرید کوٹی، عین الحق	اردو الفاظ کی اصل	اردو نامہ، ص ۹۱ تا ۱۰۰، ”
کاظمی، شبیر علی	اردو بنگلہ کا اشتراک	ماہِ نو، ص ۱۹ تا ۲۰، اگست
مختار، رومی	عربی اہم کیوں ؟	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۳ تا ۲۴، ستمبر
مرزا، غلام ربانی	علاقائی زبانوں کی آمیزش	ماہِ نو، ص ۴۵ تا ۴۹، ص ستمبر
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	اردو کی آوازیں	اردو نامہ، ص ۴۶ تا ۵۴، ”

مذہبیات

سیرت و سنت نبوی صلعم

اسحاق سلہٹی، مولوی محمد	کتابت حدیث	بینات، ص ۴۱ تا ۴۷، ستمبر
الاصبہانی، ابوالشیخ	اخلاق النبی صلعم	” ” ۱۰ تا ۱۸، ”
فارانی، ابو طاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور، ص ۵، ۱۹ ستمبر

ـــــــ	کاروان رسالت	بہائی میگزین، ص ۶ تا ۹، ستمبر

صدر نشیں بزم نبوت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن و تفسیر

احمد، پروفیسر انیس	قرآن کا تصور انسان	الارشاد جدید، ص ۲۸ تا ۳۱، ۱۰ر جولائی ویکم اگست
ارشد، سید مطیع الحسن	امن عالم قرآن کی روشنی میں	فکر و نظر، ص ۷ تا ۱۰۶، ستمبر
اصلاحی، مولانا ضیاء الدین	قرآن کی انذار انگیزی	تہذیب الاخلاق، ص ۵۴ تا ۵۸، ستمبر
اصلاحی، مولانا امین احسن	تفسیر سورہ آل عمران	تجلی، ص ۳۵ تا ۴۴، ستمبر
النقوی، علامہ سید علی نقی	تفسیر قرآن	میثاق، ص ۹ تا ۲۸، "
انصاری، ڈاکٹر محمد عبدالحق	قرآن و سنت میں اخلاق	پیام عملی، ص ۹ تا ۱۰، "
تھانوی، مولانا احتشام الحق	درس قرآن (سورہ بقر)[1]	فکر و نظر، ص ۱۴۱ تا ۱۴۹، "
دریا بادی، مولانا عبدالماجد	سورہ فلق	جنگ، ص ۳، ۳ر ستمبر
" "	سورۃ الناس	صدق جدید، ص ۵، ۹ر ستمبر
عثمان، پروفیسر شیخ محمد	قرآن کا معاشی رجحان	" " ۵، ۲۳ر "
مودودی، ابوالاعلیٰ	الذاریات (تفہیم القرآن)	فکر و نظر، ص ۷ تا ۶۰، اپریل مئی
نعمانی، مولانا محمد ولی	قرآنی آیتوں کا ربط شاہ ولی اللہ کی نظر میں	ترجمان القرآن، ص ۷ تا ۳۶، ستمبر
		الرحیم، ص ۲۹۹ تا ۳۱۳، ستمبر

مسائل و مباحث

آزاد، مولانا ابوالکلام	صدائے توحید	صبح امید، ص ۹، یکم ستمبر
اکبر آبادی، سعید احمد	ہندوستان کی شرعی حیثیت	برہان، ص ۱۳۳ تا ۱۵۴، "
السباعی، ڈاکٹر مصطفیٰ الحسنی	مستشرقین کا تصور سنت (ترجمہ)	بینات، ص ۳۳ تا ۴۰، "
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۱۵۵ تا ۱۶۶، "
پھلواروی، شاہ محمد جعفر	طلاق	ثقافت، ص ۶ تا ۱۹، ستمبر
ٹونکی، مفتی ولی حسن	اسلامی قانون میں حد کا تصور	بینات، ص ۱۹ تا ۳۲، "
رام نگری، ابو محمد امام الدین	آریہ سماجی عقیدہ نجات کا تحقیقی جائزہ	انوار اسلام، ص ۵ تا ۵۲، "

---

[1] تفسیر قرآن مجید کا مستقل سلسلہ دیگر اقساط ۱۰ر ۱۷ر اور ۲۴ر ستمبر کے جنگ میں ملاحظہ فرمائیں

رفیع اللہ، پروفیسر ابو شہاب	شرعی حدود کا فقہی تصور	فکر و نظر، ص ۶۷۳ تا ۶۰۱، اپریل مئی
″	طلاق بدعت اور خاندانی منصوبہ بندی	″ ″ ۷۷۰ تا ۷۷۶، جون
زبیری، مولانا عزیز	قرآنی لاماؤں کی باتیں۔ منکرین حدیث کے خیالات کا جائزہ	الارشاد جدید، ص ۱۰ تا ۱۵، ۱۶ جولائی و یکم اگست
سرور، محمد	اسلام کا معاشی انقلاب	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴، ۱۳ ستمبر
شیرازی، حکیم آزاد	شاہ ولی اللہ اور اسلامی سوشلزم	″ ″ ۹، ۱۹ ″
صدیقی، عبدالحمید	تجدید مذہب اور اس کی ذمہ داریاں	ترجمان القرآن، ص ۳۷ تا ۴۸، ستمبر
صدیقی، نجات اللہ	شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	زندگی، ص ۹ تا ۲۴، ستمبر
عباسی، پروفیسر منظور احسن	حدود اللہ کی بحث	آمین، ص ۸ تا ۹ + ۱۴، ۳۰ ستمبر
عثمانی، محمد تقی	دعا کیوں کی جائے	فاران، ص ۴۴ تا ۵۸، ستمبر
عثمان، مولانا شائق احمد	اذان کیا ہے؟	انجام، ص ۵، ۳ ستمبر
عمری، سید جلال الدین	انکار دین کے اسباب	زندگی، ص ۲۵ تا ۳۹، ستمبر
فضل الرحمان، ڈاکٹر	مسئلہ زکوٰۃ ۔ چند سوالات	فکر و نظر، ص ۷۶۶ تا ۷۶۹، جون
مسعود، خالد	زکوٰۃ (۲)	میثاق، ص ۲۹ تا ۳۲، ستمبر
مکی، مولوی احمد	کتب سماوی پر ایک نظر	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۹ تا ۱۳، ستمبر
مودودی، ابوالاعلیٰ	برطانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل	ترجمان القرآن، ص ۴۹ تا ۵۹، ″
ناصر ایم اے، عبدالہادی	امام ابوداؤد صاحب السنن کے اصول درایت	فکر و نظر، ص ۷۵۷ تا ۷۶۵، جون
ندوی، سید سلیمان	اسلام کی تعلیم وحدت	المنبر، ص ۹ تا ۱۰، ۲۳ ستمبر
ہالے پوتہ، ڈاکٹر عبدالواحد	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ	الرحیم، ص ۲۴۵ تا ۲۶۰، ″
	ابن سینا اور راسخ العقیدہ مسلمان	فکر و نظر، ص ۶۳۵ تا ۶۴۶، اپریل مئی
	مصابیح الاسلام کا تحقیقی جائزہ	تجلی دیوبند، ص ۶۷ تا ۷۳، ستمبر

نفسیات

رئیس امروہوی	القائے غیب	جنگ، ص ۷، ۱۹ ستمبر
″	روحانی انقلاب (انسانی کردار کا نفسیاتی جائزہ)	″ ″ ۷، ۵ ″
″	نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰۲ تا ۱۰۹، ستمبر

Regd. S. No. 1138

Phone : 232784

Monthly **QAOMI ZABAN** Karachi

نیشنل
بینک
آف پاکستان

قومی ترقی
میں
معاون

فراخ دلی سے
قرضہ دیکر
چھوٹا کاروبار کرنیوالوں
کی امداد
کرتا ہے

united N.B.4^/161

مدیر: مشفق خواجہ

محمد مصلح الدین سعدی کے زیر اہتمام انجمن پریس سے شائع ہوا